شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن

ترتیب

انٹرویو

جناب غ۔ بیابانی صاحب! سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس اہم انٹرویو کے لئے وقت نکالا۔ امید ہے کہ آج اپنی تخلیقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے اب تک بھوتوں پر جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ آپ کے سبک رفتار قلم سے نکلے ہوئے بھوتوں کے افسانے اور ناول از حد مقبول ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس موضوع پر لکھنے والوں کی تعداد کم ہے اور پڑھنے والوں کی زیادہ۔ تو بیابانی صاحب یہ بتایئے کہ آپ نے بھوتوں پر قلم کب اٹھایا۔۔؟

"تقریباً سات برس ہوئے کہ میری پہلی کہانی۔۔۔۔۔"

"میں عرصہ نہیں پوچھ رہا۔ یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ خاص کیفیت وہ جانی پہچانی خلش، وہ مخصوص کسک۔۔۔ جو فن کار کو اظہار پر اکساتی ہے، اس نے آپ پر کب غلبہ پایا؟ غالباً آپ شاعری کو میڈیم بنانا چاہتے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا

ہوتا ہے کہ وہ کون سی وجوہات تھیں جن سے مجبور ہو کر آپ بھُوت نویس بن گئے؟ آپ ہی نہیں لاتعداد آرٹسٹ آفاقی معیار کی تلاش میں تذبذب اور خلجان کے مراحل طے کر کے بالآخر اپنے سامنے ابہام کی دیوار کھڑی دیکھتے ہیں۔ لٰہذا کسی اور میڈیم کو چُننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے بھی شاعری کا ارادہ ترک کر دیا۔"

"لیکن شاعری کے متعلق تو میں نے آج تک سوچا تک نہیں۔۔۔"

"صحیح فرمایا۔ ایسی باتیں سوچی نہیں جاتیں۔ بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ شاعری محض حساس طبع کی مرہونِ منت ہے۔ نیز جمالیات، اخلاقیات اور نفسیات۔۔ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے آپ کتنی ہی کوشش کریں آپ کا شُعور آپ کے تحت الشُعور پر قابو نہیں پا سکتا۔ ظاہر ہے ایک FRUSTRATED شاعر چند انجانی وجوہات سے مجبور ہو کر بھُوت نگار بن گیا ہے۔ بہر حال چونکہ آپ یہ موضوع منتخب کر چکے ہیں اس لئے میں یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ آپ کو مبارکباد کا مستحق ہونا چاہیے کہ اتنی سی عمر میں آپ کو بھوتوں کا اس قدر گہرا اور ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے۔ آپ کی یہ آپ بیتیاں کافی دلچسپ ہیں۔ بتائیے یہ کیوں دلچسپ ہیں؟"

"مگر یہ آپ بیتیاں ہرگز نہیں ہیں۔ جو پُراسرار اور ڈراؤنے واقعات دوسروں سے سُنے اور دلچسپ معلوم ہوئے انہیں لکھ دیا تھا۔۔"

"اگر یہ آپ بیتیاں نہیں ہیں تو آپ نے صیغۂ واحد تکلّم کیوں استعمال کیا ہے؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"یہی کہ۔۔۔ میں نے یہ دیکھا۔۔۔۔ میں نے یوں محسوس کیا۔۔۔ مجھ پر ایسا اثر ہوا۔ ظاہر ہے کہ جہاں یہ میں کا استعمال آپ کی EGO یعنی انا کو اُبھارتا ہے وہاں آپ کو دیگر بھُوت نویسوں میں ممتاز بھی کرتا ہے۔ ہے نا؟"

"لیکن جہاں دوسرے لکھنے والے اپنے کرداروں کے نام رکھتے ہیں اور کچھ مصنّف وہ، اُس اور اُن وغیرہ سے کہانی بیان کرتے ہیں، وہاں میں نے بھی ہم، میں، مجھ سے۔۔۔۔"

"بجا فرمایا! بعینہ یہی سادگی اور خوش فہمی آپ کے کرداروں میں بھی موجود ہے۔ آپ کے کیریکٹر سب لوگوں کو اپنی طرح سیدھے سادے اور حلیم سمجھتے ہیں، حالانکہ جارج برناڈ شا فرما چکے ہیں کہ۔۔۔۔ 'انتہائی شریف ہونا انسان کے لیے بے حد خطرناک ہو سکتا ہے۔' دورِ جدید اور اس کے ہنگاموں کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ غالباً آپ کے کردار نہیں جانتے کہ پُرامن خاموش اور ساکن ماحول ہی

میں کچھ لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح پیش آسکتے ہیں لیکن جہاں مقابلہ ہو وہاں افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ ہر ایک دھکے دیتا ہوا زبردستی آگے نکلنا چاہتا ہے۔ کسی بڑے شہر میں پیدل چل کر یا کسی شاہراہ پر موٹر چلا کر ملاحظہ فرمایئے۔ دوسرے ڈرائیوروں، خصوصاً ٹرک اور ویگن چلانے والوں کا رویّہ دیکھ کر آپ کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی اور کسی ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کا نظارہ دیکھ کر بھی۔ اسی طرح آپ کے بھُوت ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے کی بجائے ہر وقت انسانوں میں الجھے رہتے ہیں کیونکہ اُنہیں چوبیس گھنٹے اور کوئی کام نہیں۔ اگر کبھی ان کے ذاتی مفاد کا تصادم ہو تو پھر ان کی یہ ساری سادگی اور خوش فہمی فوراً دھوئیں کی طرح اُڑ جائے گی۔ اور یہ ابھی کیا فرمایا آپ نے؟ آپ کے اس بیان سے میں متفق نہیں ہوں۔"

"لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔"

"آپ کی آواز تو آئی تھی۔۔"

"میں فقط کھانسا تھا۔"

"خیر، پھر اس کے علاوہ آپ کو سائنٹیفک انداز میں CAUSE اور EFFECT کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ توہمات کا زمانہ گزر چکا ہے۔ کیوں نا؟"

"پتہ نہیں آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میں نے تو معمولی سی بھوتوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔"

"تجاہلِ عارفانہ ملاحظہ ہو۔۔ یہ کون نہیں جانتا کہ بھُوت محض ایک سمبل ہے۔ ایک مشہور مغربی مفکّر نے کہا تھا کہ۔۔۔'اگرچہ بھوتوں پر میرا اعتقاد نہیں، تاہم اگر یہ ڈرانے پر تُل جائیں تو ڈر جاؤں گا۔' چنانچہ انسان ہو یا بھُوت دونوں کی شخصیتیں زندگی کی رنگارنگی کی دلیل ہیں اور اسی مرکز کے گرد گھومتی ہیں۔ کیونکہ دونوں کی ماہیت ایک ہے۔ بھوتوں کو فقط وہ لوگ نہیں مانتے جن کی زندگی بھوتوں سے محروم ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں؟ بتایئے۔۔۔"

"بتاؤں تو تب جب آپ کے اتنے مشکل فقرے جنہیں کوئی منشی فاضل ہی سمجھ سکتا ہے۔۔۔"

"اخّاہ! اس سے آپ کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ایسے روزمرہ کے فقیروں کو جو ہمارے ادبی رسائل اور ادبی انٹرویو کی زینت بنتے ہیں، مشکل کہہ کر آپ دراصل یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی طبیعت سادہ لوحی کی طرف مائل ہے۔"

"میں تو یہ کہوں گا کہ انسان اور بھُوت بالکل جُدا جُدا۔۔۔۔"

"آپ نے کتنی عمدہ بات کی ہے۔ اگر بہ نظرِ عمیق دیکھا جائے تو بھُوت انسان کی لاشعوری کیفیت کا دوسرا روپ ہے۔ بھوتوں کے متعلق لکھتے وقت مصنّف کا روئے سخن در حقیقت انسانوں کی جانب ہوتا ہے۔۔۔ لیکن انسان میں چھپے ہوئے بھُوت کی جانب یا بھُوت میں پوشیدہ انسان کی طرف۔۔۔۔ تبھی جن باتوں کا اظہار آپ خود نہیں کرنا چاہتے انہیں بھوتوں سے کہلواتے ہیں۔۔۔"

"وہ کون سی باتیں ہیں؟"

"مثلاً آپ کی ایک کہانی میں جہاں ایک لڑکا بھُوت سے ڈر کر اندھے کنوئیں میں گر جاتا ہے لیکن کنواں خشک ہونے کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ وہاں دراصل آپ نے میونسپلٹی پر چوٹ کی ہے جو اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ کنوئیں کے ارد گرد کٹہرہ لگوادے یا کم از کم اَٹے ہوئے کنوئیں کو کھدوا کر صاف ہی کرادے۔"

"جناب یقین کیجئے، میں نے تو ایک معمولی سا واقعہ بیان کیا تھا۔ یہاں کسی پر چوٹ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔"

"اُفّوہ! تو آپ کی خود اعتمادی پر بھی بڑی آسانی سے شُبہ کیا جا سکتا ہے ورنہ آپ۔۔۔ یقین کیجئے۔۔۔ فقط۔۔۔۔ دراصل۔۔۔ وغیرہ کا سہارا نہ ڈھونڈتے۔ یہاں آپ کا ایک اور افسانہ یاد آ گیا جس میں دو حضرات کے نام بالکل متضاد

ہیں۔ ایک کا نام نذیر ہے اور دوسرے کا بے نظیر۔ شاید آپ یہ کہیں کہ ان کے ہجے مختلف ہیں۔ ایک میں 'ذ' ہے اور دوسرے میں 'ظ'۔ بہر حال یہاں آپ نے معاشرے پر چُوٹ کی ہے کہ جس میں ایک نام کا SOUND EFFECT دوسرے کو NEUTRALISE کرتا ہے اور ساتھ ساتھ سماج۔۔۔"

"لیکن یہ تو آپ اپنی طرف سے خواہ مخواہ۔۔۔"

"بجا فرمایا۔ اور جہاں آپ نے اپنے مشہور ناول کے صفحے پر لکھا ہے کہ۔۔۔ 'اس از حد پراسرار ماحول میں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ ہونٹوں پر جھاگ آ گیا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے اور عضو عضو کانپنے لگا۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر آسمان کی طرف بازو اُٹھایا اور پورا مُنہ کھول کر دلدوز چیخ ماری'۔۔۔ تو یہاں آپ نے کلاسیکی موسیقی پر طنز کی ہے۔ واقعی گوّیے کی بالکل ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے۔"

"میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس عبارت کا کلاسیکی موسیقی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ تو محض۔۔"

" صحیح فرمایا۔ تو گویا آپ مانتے ہیں کہ اس موضوع میں بلا کی لچک ہے اور بھوتوں کی آڑ لے کر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کے کردار اس حقیقت سے ناآشنا کیوں ہیں؟ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کی ساری کتابوں میں ایک بھُوت بھی ایسا نہیں جو ترقّی پسند ہو یا REACTIONARY یا کم از کم NON-CONFORMIST ہی ہو۔ کبھی کبھی شُبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ کے سب کردار ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ وہ عقلمند نہیں ہیں لیکن انہیں بے وقوف بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے کبھی اچھے دن ضرور دیکھے ہوں گے لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور یہ کردار اتنے کم گُو ہیں کہ گمان ہوتا ہے جیسے مصنّف نے ان کے ہونٹوں کو قُفل لگا کر چابیاں کسی دریا میں پھینک دی ہیں۔"

"مگر آپ میری بات تو سنتے ہی نہیں۔"

"آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ سب جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے مفکّروں کے نظریات نے احساس و فکر کے انداز کو یکسر بدل دیا ہے۔ ان دنوں جب کہ۔۔۔ SURREALISM اور IMPRESSIONISM اور EXISTENTIALISM وغیرہ گھریلو الفاظ بن چکے ہیں، آپ کی تحریروں پر بھی نکھار آنا چاہیے۔ کاش کہ آپ پرانے الف لیلوی بھوتوں اور ماڈرن بھوتوں کے بے شمار مسائل کا تجزیہ کریں۔ نیز اس سمبل کو مشرقی اور مغربی کلچر

کے باہمی موازنے کے لئے استعمال میں لائیں تا کہ مغرب کی ترقّی کا اصل راز معلوم ہو اور یہ تبھی ممکن ہو گا جب آپ کے بھُوت زندگی اور اس کے پیچیدہ مسائل کو سنجیدگی سے دیکھنے لگیں گے۔ میری دِلی خواہش ہے کہ آئندہ آپ اپنے بھوتوں کو MOTIVATE کریں۔"

"لاحول ولا۔۔۔ حد ہو گئی۔۔۔ آپ تو بالکل۔۔۔"

"جی ہاں۔ تو گویا آپ متفق ہیں کہ صحیح MOTIVATION سے سب کچھ درست ہو سکتا ہے اور اس کے لئے آپ پوری کوشش کریں گے۔ غول بیابانی صاحب۔۔۔ میرا مطلب ہے غ۔ بیابانی صاحب! مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج آپ نے اپنی تحقیقات کے متعلق اتنی واضح بصیرت افروز بھرپور، اس قدر گمبھیر، جامع اور گنجلک باتیں کیں۔"

"اس قدر کیا باتیں۔۔۔؟"

"خوب! تو آپ سے انٹرویو اس درجہ کمال رہا کہ میں دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

استفسارات اور جوابات

رسالے کے اجرا کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہو گا کہ پڑھنے والوں کی طرف سے ایڈیٹر کے نام طرح طرح کے سوالات موصول ہونے لگے۔ ان ہی دِنوں ہم رسالے کی فروخت بڑھانے کے متعلق سوچ رہے تھے کہ جب تک سوالات و جوابات کا کالم نہ ہو، فلمی سیکشن یا انعامی معمّے نہ ہوں، پرچہ زیادہ نہیں بکتا۔ چنانچہ ہمیں استفسارات و جوابات کا سلسلہ شروع کرنا پڑا۔

یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کسی سوال کے لئے حکیموں سے مشورہ لینا پڑتا تو کسی کے لئے لٹریچر کے پروفیسروں سے۔ تیسرے سوال کا جواب کوئی درزی ہی دے سکتا تھا تو چوتھے کا ماہر نفسیات، پانچویں کا شاعر، چھٹے کا مؤرّخ، ساتویں کا باورچی، آٹھویں کا کوئی ماڈرن خاتون وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال کیسا ہی سوال پوچھا گیا ہم نے کسی نہ کسی طرح اس کا موزوں ترین جواب بہم پہنچایا۔ نیز اس سلسلے میں جو خط و کتابت ہوتی تھی وہ بھی صیغۂ راز میں رکھی گئی۔ فقط سوال پوچھنے والے کا نام اور پورا پتہ شائع کر دیا جاتا۔

پھر پتہ نہیں کیوں آہستہ آہستہ سب کا جوش و خروش کم ہونے لگا۔ چند ہی مہینوں میں سوال آنے بند ہو گئے اور ہمیں خود سوال گھڑنے پڑے۔ آخر مجبوراً وہ کالم بند کرنا پڑا۔ لیکن ہم اس کی وجہ نہیں سمجھ سکے۔ یہ تو نا ممکن ہے کہ فقط تین چار مہینوں میں رسالے کے خریدار خود بخود اتنے سمجھدار ہو گئے کہ انہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں رہی۔

پُرانے شماروں کی ورق گردانی کرتے وقت ہمیں خیال آیا کہ استفسارات و جوابات کا کچھ حصّہ پڑھنے والوں کی یاد دہانی کے لئے دوبارہ پیش کیا جائے تو شاید اُن پر خاطر خواہ اثر ہو اور یہ مفید سلسلہ پھر جاری ہو سکے۔

(ایڈیٹر)

سوال: اُمید ہے کہ میرا نام پڑھتے ہی پہچان گئے ہوں گے کہ میں وہی جانی پہچانی ریڈیو آرٹسٹ ہوں۔

ہوا یہ کہ کچھ عرصے سے میرا گلہ خراب رہنے لگا تھا۔ حلق میں کبھی خشکی سی ہو جاتی، تو کبھی گُدگُدیاں سی ہونے لگتیں۔ گلے کے ایک سپیشلسٹ، جو میرے مدّاح ہیں اور میرا گانا بڑے شوق سے سُنتے ہیں، اُن کی ضد پر ٹانسل نکلوانے پڑے۔ جس سے گلا تو کچھ ٹھیک ہو گیا اور صحت بھی اب بہتر ہے۔ ماشاء اللہ وزن

میں پچیس تیس سیر کا اضافہ ہُوا ہے۔ لیکن جب پکّے راگ گاتی ہوں تو وہ بات نہیں بنتی۔

مثال کے طور پر جب راگ ہنڈول کا انترہ اُٹھاتی ہوں تو سُننے والوں کو کبھی کھرج کا گمان ہوتا ہے۔ ایک شام کو تو بھاگیشری چلنتر میں بالکل ایمن لگ رہی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ان سب میں زمین آسمان کو فرق ہے۔

اچھے بھلے ٹانسل نکلوانے سے جو میرے کیریر پر اثر پڑ رہا ہے اس کے لئے اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اِن حالات میں ہم اس کے سوا کیا مشورہ دے سکتے ہیں کہ آپ اپنے مدّاح سپیشلسٹ سے کہیں کہ وہ ٹانسل۔۔ یا کوئی اور چیز۔۔ آپ کے گلے میں فِٹ کر دیں۔

سوال: میرے ایک سیلانی دوست کو پرندوں سے اتنی دلچسپی ہے کہ اس نے ولایت سے ایک نہایت قیمتی دوربین منگوائی ہے کہ پرندوں کی خَرمستیاں دُور سے دیکھ سکے۔ کیونکہ جب کبھی یہ ان کے قریب جاتا ہے تو وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی اُڑ جاتے ہیں (اس میں پرندوں کا قطعاً قصور نہیں، لیکن مجھے تو ان چوپائیوں سے لگاؤ ہے جو اخباروں پوسٹروں اور ریڈیو کی خبروں کے مطابق معدوم ہوتے

جا رہے ہیں۔ بار بار التجا کی جاتی ہے کہ انہیں بچائیے ورنہ وہ بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔

کلب میں میرے ایک شکاری دوست نے بتایا کہ اس نے جنگل میں ایک چیتا دیکھا جو کُچھ کُچھ ہرے رنگ کا تھا۔ اس پر دوسرا شکاری بولا کہ وہ ریگستان میں ایک نیلے رنگ کے بھیڑیے کو دیکھ چکا ہے۔ تیسرے نے پہاڑ پر ایک ٹیکنی کلر بارہ سنگھے کی اُوٹ پٹانگ حرکتوں کا ذکر کیا جس سے وہ (یعنی میرا دوست) کافی محظوظ ہوا۔

ایسے رنگ برنگے نایاب چوپائے رکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ملیں گے؟

جواب: عجب اتفاق ہے کہ چند ہفتے ہوئے ہمارا ایک شکاری دوست اپنے شکار کے دورے سے واپس آیا تو کلب میں اس نے بتایا کہ جنگل صحرا اور پہاڑ کے بالکل یہی تینوں چوپائے ایک جگہ اس نے اکٹھے بیٹھے ہوئے دیکھے۔ اس کی آہٹ پا کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور شمال کی جانب چل دیئے۔ غالباً وہ اکٹھے سفر کر رہے ہوں گے۔

دوست کے پاس بھری ہوئی رائفل تھی لیکن تحفظِ حیوانات کے سلسلے میں انہیں کچھ نہ کہا۔ اور آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ سرحد وہاں سے خاصی دُور تھی۔

سوال: میں کافی عرصے سے اُردُو شاعری پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ بڑی عرق ریزی کے بعد میرا مقالہ مکمل ہونے والا ہے۔ فقط ایک معمولی سی بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے کُچھ شُبہ سا ہو گیا ہے کہ میر حسن، میر تقی اور امیر مینائی رشتہ دار تھے؟

جواب: کس کے؟

سوال: میں نے فنِ زندگی پر چند کتابیں پڑھیں جو بے حد پسند آئیں۔ ان میں چُست رہنے اور مُسکرانے کی خاص طور پر تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ میں نے پھُرتیلا بننے کی کوشش کی اور معمول بنالیا کہ چہرے پر مسکراہٹ رہے۔ اس سے بڑا فائدہ ہوا اور میں ہر وقت مسرور رہنے لگا۔ لیکن نہ جانے کیوں دوسروں پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ جہاں جاتا ہوں لوگ مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسے مجھ سے چِڑے ہوئے ہوں۔ چند ایک تو صاف صاف پوچھ چکے ہیں کہ بات کیا ہے؟ یا تو مجھے مُسکرانا نہیں آتا یا میں نے غلط کتابیں پڑھ لیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: نہ آپ کی مسکراہٹ میں نقص ہے نہ ان کتابوں میں۔ کاش کہ آپ نے پہلے پوچھ لیا ہوتا تو ہم خبردار کر دیتے کہ ہمارے ہاں خوش رہنے کا رواج نہیں ہے۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ دل ہی دل میں مسرور ہو لیا کریں لیکن باقاعدہ مُسکرایا نہ کریں۔

اسی سلسلے میں ایک اور صاحب بھی ہم سے شکایت کر چکے ہیں کہ نئے دوست بنانے اور ہر دلعزیز بننے کے سلسلے میں انہوں نے فنِ زندگی پر مشہور کتابیں پڑھیں۔ جب ہدایات پر عمل کیا تو جو رہے سہے چند دوست تھے وہ بھی آہستہ آہستہ کنارہ کش ہو گئے۔

یہ مغربی کتابیں اغیار کے لئے لکھی گئی ہیں، ہمارے لئے نہیں۔

سوال: پڑوس سے رات بھر کھانسنے کی آواز آتی ہے جس سے سونا محال ہو جاتا ہے۔ بار بار جھانک کر دیکھتا ہوں (بعض اوقات ٹارچ کی مدد سے) کہ ایسی بھیانک اور کرخت کھانسی کس کی ہو سکتی ہے؟ لیکن نیچے احاطے میں فقط چند اُونٹ اور بیل بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

پڑوسی غصّیل اور بے مروّت سے لوگ ہیں اس لئے ان سے پوچھنے کو جی نہیں چاہتا۔ متواتر جھانک جھانک کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رات کو وہ بیل اور اُونٹ ہی کھانستے ہوں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اُونٹ اور بیل کیونکر کھانس سکتے ہیں جبکہ وہ نہ سگریٹ پیتے ہیں نہ حقّہ۔

سوال: میں لٹریچر کی طالبہ ہوں۔ تقریباً انیس سال عمر ہے۔ اور مجھے تھامس ہارڈی، ترجنیف اور کپلنگ کی مسحور کُن اور دلکش تحریروں سے اس قدر اُلفت ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کہیں یہ حضرات شادی شدہ تو نہیں؟

جواب: یہ حضرات شادی شدہ ہی نہیں بلکہ ان کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔

سوال: اتفاق سے میں کافی بھاری بھر کم ہوں۔ ورزش اور DIETING کے علاوہ جنہیں میں غیر فطری حرکتیں سمجھتا ہوں بہتیرے جتن کئے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ ابھی ابھی کسی نے بتایا ہے کہ مالش کرانے سے وزن کم ہو جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: بالکل صحیح ہے۔ اس سے واقعی وزن کم ہو جاتا ہے۔ مالش کرنے والے کا۔

سوال: میرے خیال میں مغربی لباس کا سب سے تکلیف دہ جزو ٹائی ہے۔ یہ قطعاً فضول معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم ہیں کہ سب کے سب ٹائی کے شوقین ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا آپ ٹائی کا ایک بھی فائدہ گنوا سکتے ہیں؟

جواب: ٹائی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے اُتارتے وقت بڑی فرحت محسوس ہوتی ہے۔

سوال: میری شادی کو چھ برس ہو چکے ہیں۔ ویسے سب خیریت ہے لیکن رشتہ داروں پر اب تک بحث ہوتی رہی ہے۔ بیوی بار بار یہی گلِہ کرتی ہے کہ آپ اپنے عزیزوں کو میرے رشتہ داروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ یہی شکایت مجھے بیوی سے رہتی ہے۔ زیادہ دنگا فساد ایک دوسرے کی ساس پر ہوتا ہے۔ بتایئے کہ کیا کیا جائے؟

جواب: اگر آپ بیگم کو یقین دلا دیں کہ اپنی ساس کے مقابلے میں آپ کو ان کی ساس زیادہ عزیز ہے تو پھر انہیں کوئی گلِہ نہیں رہے گا۔

سوال: میں فلسفۂ عدم تشدد (یعنی اہنسا) کا قائل ہوں اور دوسروں کی زیادتیاں برداشت کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں۔ مدّتوں میں نے اس اصول پر عمل کیا ہے کہ اگر کوئی تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔ لیکن کبھی کبھی

عجیب عجیب خیالات آنے لگتے ہیں۔ یہی کہ دوسرے اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اور پھر دنیا میں زیادتیاں کرنے والوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے؟

جواب: غالباً آپ اس فلسفے کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔ اس پر دوبارہ غور کیجئے۔ ہدایات پہلے دو تھپڑوں تک محدود ہیں۔ لہٰذا دونوں گالوں پر ایک ایک تھپڑ برداشت کر چکنے کے بعد تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا اور باقی ماندہ سارے تھپڑ آپ کی طرف سے لگنے چاہئیں۔ اُس کی اچھی طرح سے پٹائی کیجئے۔

سوال: مندرجہ ذیل آزاد نظم کو سمجھنے کی بہتیری کوشش کرتا ہوں لیکن کُچھ پلّے نہیں پڑتا۔ حالانکہ یہ سالِ رواں کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ کیا آپ اس کے معنی سمجھا سکتے ہیں؟

ایک سوال

بے کراں رات کے سناٹے میں

آتشیں سائے، لہو کے دریا

صدیوں پہلے کے کسی ناگ کی پھنکار کی گونج

چیختے دھاڑتے لاوے کی تپش

تیرہ و تار سی جھلسی ہوئی گمنام حیات

زیر و بم ہے کسی مدقُوق کی سانسوں کا تمنّاؤں کا

شاخ بے برگ کی لرزش کسی طوفاں کی خبر دیتی ہے

واہمہ ہے یا حقیقت یا گراں بارئ خواب

یہ ہیولے ہیں کہ عفریت کہ فرسودہ نظام

یہ کہیں میں تو نہیں؟

جواب: ہمارے خیال میں اگر اس لافانی نظم کو اس طرح پڑھیں تو شاید سمجھ میں آجائے۔

ایک سوال

یہ کہیں میں تو نہیں؟

یہ ہیولے ہیں کہ عفریت کہ فرسودہ نظام

واہمہ ہے یا حقیقت یا گراں بارئ خواب

شاخِ بے برگ کی لرزش کسی طوفاں کی خبر دیتی ہے

زیر و بم ہے کسی مدقُوق کی سانسوں کا تمناؤں کا

تیرہ و تار سی جھلسی ہوئی گمنام حیات

چیختے دھاڑتے لاوے کی تپش

صدیوں پہلے کے کسی ناگ کی پھُنکار کی گونج

آتشیں سائے لہو کے دریا

بے کراں رات کے سناٹے میں

سوال: جب سے جرنلازم پڑھنا شروع کیا ہے نہایت مفید اور انوکھی باتیں سُوجھنے لگی ہیں۔ کئی تو ایسی ہوتی ہیں جن کا جواب میرے پروفیسر بھی نہیں دے سکتے۔ مثال کے طور پر چند نمونے ارسال ہیں۔ کیا آپ ان کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

- سُسرال والوں کو کیوں IN-LAWS کہا جاتا ہے جبکہ در حقیقت وہ OUTLAWS ہوتے ہیں۔

- مریضوں کے لئے لفظ PATIENT کیوں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ وہ ہر وقت IMPATIENT رہتے ہیں۔

- MTERIC سسٹم نے فرلانگ اور میلوں کو کلو میٹر میں تبدیل کر دیا، من اور سیر وں کو کلو گرام میں۔ اسی طرح کپڑا یا پٹرول خریدتے وقت بھی میٹر اور LITRE سُنُنے پڑتے ہیں۔ بھلا وقت نے کیا قصور کیا ہے جو اب تک سو سیکنڈوں کا ایک منٹ نہیں بن سکا۔ سو منٹوں کا ایک گھنٹہ، سو گھنٹوں کا ایک دِن اور سو دِنوں کا ایک مہینہ نہیں ہوا۔ اور سو مہینے کا ایک برس۔ جبکہ صدی تو پہلے ہی سے سو سال کی ہے۔

جواب: ہم نے قارئین سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ سوال پوچھتے وقت عبارت خوشخط لکھا کریں، صاف کاغذ استعمال کریں۔ کاغذ کے فقط ایک طرف لکھیں اور حاشیہ چھوڑنا نہ بھُولیں۔

سوال: میں نے ایک طوطا پال رکھا ہے جسے غور و خوض کی عادت ہے۔ بعض اوقات تو وہ کئی کئی گھنٹے سوچتا رہتا ہے۔ دوسرے طوطوں کی طرح نہ وہ باتونی ہے اور نہ طوطا چشم۔ لیکن پرسوں سے وہ بالکل چُپ چاپ لیٹا ہوا ہے۔ نہ بولتا ہے نہ بُلانے پر جواب دیتا ہے۔ میرے خیال میں طوطا کسی مسئلے پر غور کر رہا ہے۔ گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں؟

جواب: غالباً آپ کا طوطا مراقبے میں ہے اور اگر مراقبے میں نہیں ہے تو پھر اس کا مکمل طور پر انتقال ہو چکا ہے۔

سوال: نظم اور غزل میں کیا فرق ہے؟

جواب: نظم میں شاعر کی چھوٹی سی بات کو بڑھا کر بیان کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔یا بڑی ساری بات کو مختصر کر دیتا ہے۔ مگر اس طرح کہ روئے سخن ایک طرف ہی رہتا ہے اور موضوع نہیں بدلتا۔ لیکن غزل کے ہر شعر کا موضوع جُدا ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے شعر میں خُدا کی تعریف ہے تو دوسرے میں محبوب کی بے وفائی کا گلہ۔ تیسرے میں انتقال ہو چکنے کے بعد کے اثرات کی ترجمانی ہے۔ چوتھے میں موسم کے یکلخت خوشگوار ہو جانے پر مَے خانے کی حاضری کا ذکر۔ پانچویں میں اپنی حالت کا رونا اور دنیا کے نظام میں فوری تبدیلی کی خواہش، چھٹے میں محبوب نمبر دو کی وفا داری کی خوشخبری۔ اور آخر میں تخلّص اور اپنی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف۔ سمجھ لیجئے کہ نظم کا مطالعہ کسی جواب مضمون پڑھنے کے برابر ہے اور غزل پڑھنا ایسا ہے جیسے اخبار کھول کر خبریں دیکھنا۔

سوال: ان دنوں فلسفے، تحت الشُعور اور نفسیات وغیرہ کا بڑا زور ہے۔ بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں بیٹھے بٹھائے کچھ ہو نہ جائے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ماہرِ نفسیات کے پاس جائے بغیر یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ انسان کا دماغ ٹھیک ہے یا نہیں؟

جواب: اگر انسان کو خود اپنی دماغی حالت پر کبھی کبھی شُبہ ہو جاتا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ دماغ نارمل ہے۔ لیکن اگر اُسے دوستوں واقف کاروں اور اجنبیوں کی

دماغی حالت پر مستقل طور پر شُبہ رہنے لگے تو پھر لازمی طور پر خلل آ چکا ہے۔ جس کا علاج ماہرِ نفسیات بھی نہیں کر سکتے۔

سوال: میرا خیال ہے کہ قدرت ایسی اشیائے مُدرکہ سے مل کر بنی ہے جو ایک دوسرے کے کُل میں جُزو کی حیثیت سے شامل ہیں جہاں اضدادی اسلوبِ تفکّر تمام اشیائے مدرکہ کو سمجھنے کے لئے کیا گیا ہے، وہاں فلسفیانہ دقیقہ رسی، توازنِ اتصال اور امدادی مادیت کو قوتیاتی نظریہ کا رُتبہ حاصل ہے۔ کائنات کی حیاتِ مادی ہی مقدم ہے۔ اس کی حیاتِ روحانی ثانوی اور استخراجی ہے۔ اعصابی کیفیتیں اور ناآسودہ جبلّتیں دراصل خارجی حقیقی چیزوں اور ان کے ارتقا کا عکس نہیں ہیں بلکہ خارجی چیزیں اور ان کا ارتقا حقیقت کی شکل میں اس تصوّر کا محض عکس ہیں جو وجودِ کائنات سے قبل تھا۔ مفکّروں کے نزدیک کائنات اور جملہ نظامات ابدی اور استقراری ہیں اور خیالِ نفسِ ناطقہ پر عالمِ بالا کے ترشحات کا نتیجہ ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کائنات کا ارتقاء تجویز اور تردید کے تصادم سے عبارت ہو گا تو پھر تدریجی وقفے کے بعد نقطۂ تغیّر کب ظہور پزیر ہو گا؟ وہ کون سی تردید ہو گی جو تجویز سے متصادم ہو کر نئی ترکیب کو وجود میں لائے گی؟

جواب: اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

سوال: میرا چھوٹا بھائی جو کہ بلا کا ذہین ہے۔ یوں تو بچپن ہی سے شرارتی اور گستاخ تھا لیکن جب سے وہ عُمر کے اس دور میں داخل ہوا ہے جسے انگریزی میں ADOLESECENCE کہا جاتا ہے تو اس کی شوخیوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

پچھلے دو سال سے وہ اس مضمون کی ٹریننگ لے رہا ہے جسے انگریزی میں PHONETICS کہتے ہیں، تاکہ کورس مکمل کر کے وہ بن سکے جو انگریزی میں LINGUIST کہلاتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں لوگ اکثر اس سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔

ہمارے چچا جان کے پلے ہوئے دوست خواجہ صاحب جب سرائے عالمگیر سے کبھی کبھی آ جاتے ہیں تو اس کو دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ بڑے ادب سے خواجہ سرا کہہ کر سلام کرتا ہے۔ اور جب کبھی ہمارے وہمی اور خشک مزاج مشتاق ماموں کا ذکر آ جائے تو فوراً کہتا ہے۔۔

وہ ہے مشتاق اور ہم بیزار

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اُدھر ہمارا توند والا مُنیم لالہ حبیب جو تھل کے صحرائی علاقے میں بنیا نما دُکان کا بھی مالک ہے، جب حساب دینے آتا ہے تو اس کا استقبال ع

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

سے کرتا ہے۔

میری پیاری سہیلی رخشندہ جب سائیکل پر اپنے کالج جاتے ہوئے ہمارے مکان کے سامنے سے گزرتی ہے تو خاصی اونچی آواز میں یہ شعر پڑھتا ہے۔ ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کمال دیکھے تھے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

والد صاحب کے ایرانی دوست آقائے زنجانی لنچ پر تشریف لائے تو ان کے سامنے سے سلاد کے پتّے اُٹھا کر ہمارے پالتو خرگوش کے سامنے رکھ دیئے اور یہ مصرعہ پڑھا: ع

برگِ سبز است تحفۂ خرگوش

اس پر زنجانی صاحب باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔

بڑے بہنوئی خورشید صاحب ہر دوسرے تیسرے ہفتے کانفرنس یا کسی دورے کا بہانا بنا کر یہاں آ جاتے (کیونکہ بڑی آپا یہاں ہیں) فوراً اگلی صبح یہ اُن کا سامان نوکروں سے بند ھواتا ہے اور یہ مصرعہ بار بار دوہراتا ہے۔ ع

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

اُدھر ہمارے دُور کے عزیز بٹ صاحب، جو بڑے خوش خوراک ہیں، اُن سے کھانے کی میز پر مؤدبانہ عرض کیا کرتا ہے۔ ے

نہ IF کیجئے اور نہ BUT کیجئے

جو مل جائے بس اس کو چٹ کیجئے

اور تو اور ہمارے محلّے کے ہر دلعزیز حکیم جناب مسیح الزماں کا نام اس نے قبل از مسیح الزماں رکھا ہوا ہے۔ کیا کیا مثالیں دوں۔ اتوار کو چڑیا گھر میں مور کو ناچتے دیکھا تو خاموش ہو کر تالیاں بجائیں اور ”ونس مور۔ ونس مور“ کے نعرے لگائے۔

کبھی کبھی میری ساس کھانے پر آ جاتی ہیں تو میز پر انہیں ٹماٹر کی ساس tomato sauce کی بوتل پیش کرتا ہے۔

ابھی کنوارا ہے۔ اس کے لئے تین لڑکیاں زیرِ غور ہیں۔۔ نسیم آرا، ذبیحہ خانم اور عالیہ۔ لیکن اس کا یہ حال ہے کہ اگر کبھی عالیہ کے گھر کے سامنے سے ہم گزر رہے ہوں تو یہ دوڑ کر زور زور سے کہتا ہے۔۔ ”آلیا۔۔ آلیا۔ تجھے آلیا۔۔“ ذبیحہ کا ذکر آئے تو پہلے ذبیحہ کہہ کر پھر ”ہا۔۔۔ہا۔۔ہا۔۔“ کر کے ہنستا ہے۔ اور تیسری کے نام پر چُپکے سے نسیم کہہ کر بازو کو لکڑی کاٹنے کے آرے کی طرح چلانے لگتا ہے۔

یہ بتایئے کہ یہ سب کچھ PHONETICS جسے اُردُو میں غالباً صوتیات کہتے ہیں کی ٹریننگ کا اثر ہے یا کوئی اور بات ہے؟ میں کچھ فکر مند سی رہنے لگی ہوں۔

جواب: آپ فکر کریں یا نہ کریں ہمارے خیال میں آپ کا بھائی وہ بنتا جا رہا ہے جسے انگریزی میں DELINQUENT کہا جاتا ہے۔

سوال: مجھے یہ تین کہاوتیں بہت پسند ہیں۔

- زر، زمین، زن فساد کی جڑ ہیں۔
- اصلی دوست وہ ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے۔
- دوسروں سے وہی سلوک کرو جس کی توقع تمہیں اُن سے ہو سکتی ہو۔

یہی سوچتا رہتا ہوں کہ اگر سب لوگ ان پر عمل کرنے لگیں تو دنیا کتنی بہتر جگہ بن سکتی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: غالباً آپ نہیں جانتے کہ بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ پرانی کہاوتیں بھی بدل چکی ہیں۔ فی زمانہ انہیں یوں پڑھنا چاہیے۔

- زر، زمین، زن کی کمی ہی فساد کی جڑ ہے۔
- اصلی دوست وہ ہے جسے کوئی ضرورت نہ ہو۔
- دوسروں کے ساتھ فوراً وہی سلوک کرو پیشتر اس کے کہ وہ تم سے وہی سلوک کر سکیں۔

سوال: ہمارے پڑوس میں دھوبی گھاٹ ہے۔ دھوبیوں کا کتّا دن بھر ہمارے گھر بیٹھا رہتا ہے۔ نکلتا ہی نہیں۔ بتایئے کیا کریں؟

جواب: غالباً بیچارہ کہاوت کے سلسلے میں آجاتا ہوگا۔ اسے کچھ نہ کہا کریں۔

سوال: داغ کا وہ مشہور شعر ملاحظہ ہو۔

کونین جس کے ناز سے چکرا رہے ہیں داغ

میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا

اس سے ثابت ہوا کہ ملیریا کے لئے کونین داغ صاحب کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھی اور تب بھی اس سے چکر آیا کرتے تھے۔ کتنی دلچسپ بات ہے؟

جواب: بہت؟

سوال: میری خوشدامن کو بچّوں کے سوئیٹروں کے لئے خوشنما سے خرگوش، ہرن، شیر اور بطخ کے ڈیزائن درکار ہیں، ان کی خواہش ہے کہ آپ یہ ڈیزائن اپنے پرچے میں شائع کریں۔

جواب: آپ کی خوشدامن کسی روز چڑیاگھر تشریف لے جائیں تو ان کی خواہش وہیں پوری ہوسکتی ہے۔

سوال: میں کافی عرصے سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے کوشش کر رہی ہوں۔ ابھی تک کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن میرے بال جو کبھی گھنے اور لمبے تھے، لگاتار جھڑ رہے ہیں۔ خصوصاً خزاں کے موسم میں تو بہت زیادہ تعداد میں جھڑتے ہیں۔ کوئی علاج بتایئے۔

جواب: پی۔ ایچ۔ ڈی اور گھنے بال۔۔۔ یہ دونوں چیزیں ہمیشہ متضاد رہی ہیں۔ یا تو آپ ان دونوں میں سے ایک چُن لیں یا پھر بالوں میں کنگھی بالکل نہ کیا کریں۔

اس طرح آپ کو پتہ بھی نہ چل سکے گا کہ بال کس وقت جھڑ گئے اور کتنے تھے۔ رہ گیا خزاں اور جھڑاؤ کا معاملہ، سو وہ قدرتی ہے۔۔۔ اس میں کسی کو دخل نہیں۔

سوال: مجھے گُدگُدی بہت ہوتی ہے۔ بہتیرا ضبط کرتا ہوں اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں AUTO-SUGGESTION سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ بعض اوقات تو بڑی خفّت اُٹھانی پڑتی ہے۔ کوئی علاج بتایئے۔

جواب: گُدگُدی عموماً بچّوں کو ہوا کرتی ہے۔ آفیشلی بالغ انسان کو اتنی گُدگُدی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارا یہ مشورہ ہے کہ آپ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیں جن میں گُدگُدی کئے جانے کا احتمال ہو۔ بہتر ہو گا کہ کسی ماہرِ نفسیات سے مل کر تجزیۂ نفسی کرا لیں۔ لیکن ماہرِ نفسیات کو زیادہ قریب نہ آنے دیں۔ ویسے آپ کو گُدگُدی کرتا کون ہے؟

سوال: پرانے زمانے میں لوگ بڑی لمبی عمریں پاتے تھے۔ نوّے سو برس تک زندہ رہنا عام بات تھی۔ درازیٔ عمر کا تب اصل راز کیا تھا؟

جواب: پرانے زمانے میں ذرائع آمدورفت محدود ہونے کی وجہ سے بسوں کے حادثے نہیں ہوتے تھے۔ پرنٹنگ پریس کی عدم موجودگی کے طفیل نہ رسالے

تھے اور نہ زندگی سے بیزار کر دینے والا ادب اور شاعری۔ اخبار بھی نہیں تھے اس لئے عوام سنسنی خیز جھوٹی سچی سیاسی خبروں سے محفوظ رہا کرتے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں انکم ٹیکس شروع نہیں ہوا تھا۔

سوال: مجھے مغربی ممالک سے بھی چِڑ ہے۔ اُن کی ہر بات سے مادہ پرستی ٹپکتی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ روحانیت کو چھوڑ کر یہ اتنے مادہ پرست کیوں بن گئے ہیں؟ نیز مُشکی رنگ کو سفید کرنے کے طریقے معلوم ہوں تو ضرور بتائیے۔

جواب: مغربی ممالک میں عورتوں کی تعداد مقابلتاً زیادہ ہے لہٰذا وہاں اتنی مادہ پرستی نہیں ہے جتنی کہ مشرق میں جہاں عورتیں کم ہیں اور مرد زیادہ۔

نیز مُشکی رنگ میں کیا خرابی ہے؟ مشہور کہاوت۔۔ رنگ مُشکی نہ کھنگ نہ خشکی، کے علاوہ آپ نے یہ شعر بھی شاید سُنا ہو۔ ؎

حُسن کو چاہیے انداز و ادا ناز و نمک

کیا ہوا اگر ہوئے گوروں کی طرح گال سفید

سوال: آج تک میں یہی سمجھتا رہا کہ علامہ سقراط عرب کے حکیم تھے۔ لیکن ابھی کسی نے شُبہ ڈال دیا ہے کہ یہ کسی اور ملک کے تھے اور ان کا اصلی نام ساکرے ٹیز تھا۔

اگر یہ صحیح ہے تو بابائے طِب بقراط کا اصلی نام کیا تھا؟

جواب: باکریے ٹیز۔

سوال: تزک بابری کو پڑھ کر کچھ مایوسی سی ہوئی۔ کتاب میں جگہ جگہ ہندوستان کی برائیاں لکھی ہیں۔ بابر غیر ملکی تھا۔ ایک اجنبی کی یہ تنقید بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

نیز میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان پر اتنے حملے کیوں کئے گئے جبکہ ہندوستانی شروع ہی سے عدم تشدّد کے قائل رہے ہیں؟

جواب: واقعی بابر کو ایسی تلخ باتیں نہیں لکھنی چاہیے تھیں۔ خصوصاً جبکہ اہلِ ہند کا ریکارڈ رہا ہے کہ۔۔۔

- انہوں نے کسی ملک پر حملہ نہیں کیا۔
- ایک بھی ہندوستانی سیّاح کہیں باہر نہیں گیا۔
- اہلِ ہند نے کبھی سمندری بیڑے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
- کبھی ہند کی سرحد پر حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کیا گیا۔

- اہلِ ہند نے نہ کبھی کچھ دریافت کیا نہ کچھ ایجاد کیا۔ بلکہ دوسروں کی اچھی بھلی ایجادات کا ناس مار کر رکھ دیا۔

رہ گیا دوسرے ملکوں کا رویّہ، سو اگر باہر کے لوگ ہندوستان پر بار بار حملہ نہ کرتے تو تاریخِ ہند کیونکر مرتّب ہوتی۔ مغرب سے جو حضرات آئے وہ فقط ہندوستان تک پہنچنے کا چھوٹے سے چھوٹا راستہ دریافت کرنے کے خواہشمند تھے یا گرم مصالحوں کی تلاش میں تھے۔ کم از کم پرانی تحریروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سارے یورپ کا گزارہ ہند کے گرم مصالحوں پر تھا۔

ہو سکتا ہے کہ دوسرے ملک اپنی تاریخ مرتّب کرنے کے سلسلے میں ہند پر حملے کرتے رہے ہوں۔ بہرحال آپ بابر کی تنقید کو کوئی PERSONAL رنگ نہ دیں۔

سوال: مجھے جس لڑکی سے محبّت ہے، وہ حسین ہونے کے علاوہ انٹلکچول بھی ہے۔ میں سائنسدان ہوں اس لئے علم و ادب میں دلچسپی رکھنے کی قطعاً فرصت نہیں۔ ابھی تک پیغام نہیں بھجوایا کیونکہ میرے خیال میں وہ ولی دکنی، ہربرٹ سپنسر، ابونواس اور بھرتری ہری کی جانب مائل ہے۔ جب کبھی اس سے ملتا ہوں یہی نام سُننے میں آتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آپ کے مشورے کا منتظر ہوں۔

جواب: ہمارے خیال میں آپ کو فوراً پیغام بھیجنا چاہیے۔ ان حضرات کی موجودگی میں ذراسی دیر بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال: جمشید بھائی جو دُور کے کزن بھی ہیں، ہر سہ پہر کو ہمارے ہاں آجاتے ہیں اور نو دس بجے سے پہلے واپس نہیں جاتے۔ لُو چلے، آندھی آئے، بارش ہو، وہ بلاناغہ ساری شام ہمارے ہاں گزارتے ہیں۔ لیکن ابھی تک انہوں نے پیغام نہیں بھجوایا۔ اکثر سوچتی رہتی ہوں کہ آخر ان کا ارادہ کیا ہے؟

جواب: ہو سکتا ہے کہ انہیں محبّت ہو گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوپہر کے بعد جمشید بھائی کو کوئی اور کام نہ ہوتا ہو اور محض بیکاری کی وجہ سے آجاتے ہوں۔

ویسے شام عموماً ساڑھے سات بجے ختم ہو جاتی ہے۔ رات کے نو دس بجے تک نہیں چلتی۔

سوال: پچھلے مہینے میں نے ایک چھوٹا سا السیشن کُتّا خریدا تھا۔ اس وقت تو اس کے نوکیلے کان بالکل صحیح پوزیشن میں تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ آہستہ آہستہ ملائم ہو کر مُڑنے لگے۔ اب تو تقریباً نصف کے قریب مُڑ چکے ہیں۔ بہت پریشان ہوں۔

بڑی مشکل سے یہ عمدہ کُتّا ملا تھا۔ بتایئے کیا کروں؟

جواب: غالباً آپ کتّوں کی نفسیات سے واقف نہیں ہیں۔ جتنا آپ اس کے کانوں کی طرف دیکھیں گے اتنا ہی اسے احساسِ کمتری ہو گا اور کان جھکیں گے۔

یہ کیجئے کہ گتّے یا لکڑی کے دو چھوٹے تختے لگا کر، کان سیدھے کر کے اُوپر پٹّی باندھ دیجئے اور خود دس پندرہ روز کے لئے کہیں باہر چلے جایئے یا کتّے کو کہیں بھجوا دیجئے۔ دو ہفتے کے بعد پٹّی کھولئے۔ اگر کان کھڑے نہیں ہوئے تو پھر یہ السیشن نہیں کچھ اور چیز ہے۔

سوال: میرے سر میں ایک سفید سا بُرادہ (جسے شاید بفا کہتے ہیں) بڑھتا جا رہا ہے۔ کنگھا کرتے وقت چھوٹے چھوٹے ذرّے نیچے گرتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیوں ہو جاتا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

جواب: ہمارے سر میں بھی بالکل یہی چیز بڑھتی جا رہی ہے۔ کاش کہ قارئین میں سے کوئی اس پر روشنی ڈال کر ہم دونوں کو ممنون فرمائیں۔

سوال: ان اشعار کا کیا مطلب ہے؟

لیا جس نے مجھ سے عداوت کا پنجا

سنلقی علہیم عذاباً

نکل اس کی زلفوں کو کوچے سے ارے دل

تو پڑھنا قم الیل الّا قلیلاً

جواب: ان کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو عربی بھی آتی ہے۔

سوال: میرے خاوند دفتر سے آتے ہی فائلوں، کلرکوں، آفیشل خطوں اور پالیسیوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ ساری شام بلکہ رات گئے تک یہی ذکر چلتا رہتا ہے۔ تعجّب ہوتا ہے کہ کیا دفتر میں انہیں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملتا؟

جواب: دفتر میں لوگ بیوی، بچّوں، بزرگوں، خانگی حالات اور بازار کے بھاؤ کا ذکر کیا کرتے ہیں۔

سوال: ہمارا گھوڑا علیل ہے لیکن دوائی کھانے سے انکار کرتا ہے۔ سفوف پانی میں گھول کر یا دانے میں ملا کر سامنے رکھتے ہیں تو سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ زبردستی اس کے مُنہ میں ڈالنے کی کوشش کریں تو کاٹتا ہے۔ گھوڑا ڈاکٹر صاحب سفوف کا نسخہ تجویز کرنے کے بعد بالکل سبکدوش ہو چکے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟

جواب: یہ تو بہت آسان ہے۔ بانس کا کھوکھلا ٹکڑا لے کر اس میں گھوڑا ڈاکٹر صاحب والا سفوف ڈالیں۔ بانس کا ایک سِرا گھوڑے کے مُنہ میں دے کر دوسرے سِرے سے پھُونک ماریں۔ دوائی فوراً اس کے حلق میں ہو گی لیکن ذرا جلدی کریں۔ اگر آپ کے ذہین گھوڑے نے، جس کا I.Q کافی HIGH معلوم ہوتا ہے، آپ سے پہلے پھُونک ماردی تو دوائی آپ کے حلق میں ہو گی۔

سوال: میں دانشور ہوں اس لئے مجھے لگاتار غور و خوض کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت متفرق مسائل کے حل تلاش کرنے میں لگا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی اختلاجِ قلب کی شکایت ہو جاتی ہے اور کبھی بے خوابی اور چڑچڑے پن کی۔ تو ان کا حل بھی سوچنے بیٹھ جاتا ہوں۔ نہ جانے سارے ڈاکٹر یہ کیوں کہتے ہیں کہ تم NERVOUS ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہماری رائے میں جس شخص کے جسم میں NERVES لگی ہوئی ہیں اُسے NERNOUS ہونے کا پورا حق حاصل ہے۔

سوال: آپ کے محبوب اشعار کون سے ہیں؟ آپ کو کون سا رنگ اچھا لگتا ہے؟ اور اپنے پسندیدہ ایکٹر اور ایکٹرس کے نام بھی بتائیں۔

جواب: ہمیں کُچھ اس قسم کے اشعار پسند ہیں:

بعد مدّت ملے تھے کل ان سے

آج لوگوں نے پھر لڑا مارا

ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا

داغ سا آدمی نہیں ملتا

پان الگ الگ کر مری جان کدھر جاتے ہیں

یہ مرے قتل کا سامان کدھر جاتے ہیں

رنگ تقریباً سارے پسند ہیں۔ بے رنگ چیزیں اچھی نہیں لگتیں۔ گراز چو مارکس ہمارا پسندیدہ ایکٹر ہے۔ ایکٹرس کے بارے میں ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔

سوال: میرا دوست ان دِنوں بے شمار مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ پریشانیوں سے اس کی صحت ِگرتی جارہی ہے۔ اس کا جی بالکل نہیں لگتا۔ ہر وقت مغموم رہتا ہے۔ تاش میں لگاتار ہار رہا ہے۔ ہر ہفتے گھڑ دوڑ میں ناکامیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

سنا ہے کہ وظیفے سے سب مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

جواب: دوست غریب کو بیچ میں مت لائیے۔ سیدھی طرح اپنے ذاتی حالات لکھئے۔ اور یہ کس وظیفے کا ذکر آپ نے کیا ہے؟ پڑھنے والا وظیفہ؟ یا روپوں والا؟

سوال: میرے شوہر کو آٹھ برس سے دردِ سر کی شکایت ہے۔ بہت علاج کئے، لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ کیا آپ کوئی مشورہ دے سکتے ہیں؟

جواب: آپ کی شادی کتنے سال پہلے ہوئی تھی؟ بہتر ہو گا کہ یہ سوال آپ کے شوہر ہم سے براہِ راست پوچھیں۔

سوال: گرمیوں میں آپ کا کالم پڑھتے ہوئے مجھے محترمہ رُوح افزا کا نام بہت اچھا معلوم ہوا۔ کیا ان سے خط و کتابت ہو سکتی ہے؟ ازراہِ کرم ان کا پتہ ارسال فرمائیں۔

جواب: اگر آپ مرد ہیں تو آپ کی جسارت پر افسوس ہوتا ہے۔ پتہ معلوم کرنے کا یہ حیلہ بالکل بیکار ہے۔ بھلا ایک لڑکی آپ سے کیونکر خط و کتابت کر سکتی ہے؟

اگر خدانخواستہ آپ عورت ہیں تو صاف صاف بتائیں۔

اُدھر رُوح افزا صاحبہ بھی خبر دار رہیں۔

سوال: میری شادی ہونے والی ہے۔ منگیتر کے متعلق صرف اتنا جانتی ہوں کہ بیحد سوشل ہیں اور مجھے MIXED تقریبوں میں جانا ہو گا۔ خواتین کی دعوتوں کا تو تجربہ ہے لیکن یہ مِکسڈ ڈِنر وغیرہ میرے لئے بالکل نئے ہیں۔ کیا آپ تفصیل بتا سکیں گے کہ ان میں کیا ہوتا ہے؟

جواب: بعض اوقات سہ پہر کو ٹیلیفون آتا ہے کہ اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو شام کو آپ دونوں ہمارے ہاں ماحضر تناول فرمائیں۔ یا تقریب سے ایک روز پہلے دعوتی رقعہ آتا ہے کہ عشائیے پر تشریف لا کر عند اللہ ماجور ہوں (عند اللہ ماجور اور ماحضر کا ترجمہ پتہ نہیں کیا ہے)۔ یہ ہدایت بھی لکھی ہوتی ہے کہ اگر آنا ہے تو بیشک خاموش رہیں لیکن نہ آسکتے ہوں تو ضرور اطلاع دیں۔ لیکن نہ جانے کیوں ہر مرتبہ بیشتر مہمان خاموش رہتے ہیں۔ چنانچہ بلانے والا سوچتا ہی رہتا ہے کہ کتنے آئیں گے؟ ستّر سو یا پچاس؟

عموماً سب کو آٹھ بجے بلایا جاتا ہے، لہٰذا لوگ نو بجے سے آنا شروع کرتے ہیں اور دس بجے تک آتے رہتے ہیں۔ MIXED مجمع فقط ذرا دیر کے لئے مِکسڈ رہتا ہے۔ پھر ایک دم تاش کے پتّوں کی طرح خواتین ایک طرف ہو جاتی ہیں اور حضرات دوسری طرف۔ سردیوں میں خواتین انگیٹھیوں اور HEATERS کے بالکل

سامنے جا بیٹھتی ہیں اور گرمیوں میں پنکھوں کے عین نیچے یا ایئر کنڈیشنر کے سامنے۔

پتّے ایک مرتبہ پھر بٹتے ہیں۔ ملازمت پیشہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ بزنس والے دوسری طرف اور ٹھیکیدار اور زمیندار تیسری طرف۔ اور نہایت دلچسپ اور دلپذیر گفتگو شروع ہو جاتی ہے اور ایسے فقرے سنائی دیتے ہیں:

"جناب وہ منحوس فائل واپس نہیں بھیجی آپ نے۔"

"آپ کا Boss چھٹا مکان مکمل کر چکا ہے۔ لیکن اب تک اس کے تبادلے کے کوئی آثار نہیں۔"

"یہ بتائیے کہ انکم ٹیکس والوں نے آپ سے کیونکر پیچھا چھڑایا؟"

"ساری الاٹ شدہ جائیداد کا دو مرتبہ مستقل انتقال ہو چکا ہے۔ اب اور کون سا انتقال باقی ہے؟"

"میاں صاحب اتنے دُبلے پتلے ہیں کہ زمیندار معلوم ہی نہیں ہوتے۔"

"آپ کی ایسی ہونّق اور بوسیدہ موٹر پتہ نہیں کس فرم نے اتنی مہنگی خرید لی۔"

اُدھر دوسرے کونے میں خواتین اُن خواتین کے متعلّق باتیں کرتیں ہیں جو وہاں موجود نہیں ہوتیں اور ہمدردی جتانے کی آڑلے کر ان کے لباس کی بے سلیقگی ان کے پھوہڑ پن، فضول خرچی، ان کے خاوندوں کے قرضوں اور سُسرال کے جھگڑوں کے بارے میں تازہ ترین افواہیں بہم پہنچاتی ہیں۔

میزبان کے ملازم (جو دراصل پڑوسیوں کے ملازم ہوتے ہیں) گاڑھے شربت، مونگ پھلی اور آلو کے قتلے بار بار پیش کرتے ہیں۔ (جن سے بھوک آدھی رہ جانی چاہیے)۔

کافی انتظار کے بعد "کھانا تیار ہے" کا نعرہ لگتا ہے اور دفعتاً بھاگڑ پڑ جاتی ہے۔ کھانے کے کمرے میں بھی مرد میز کے ایک کونے پر ہوتے ہیں اور عورتیں دوسرے کونے پر۔ سب پلیٹیں ہاتھ میں لئے کھانے کی طرف بڑھتے ہیں اور مکمل خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی "معاف کیجئے" یا (مرچ مصالحوں کی بہتات سے) "سوں سوں" کی آوازیں البتہ آتی ہیں۔

کچھ دیر میں سوائے ذرا سے چاول اور روٹی کے چند ٹکڑوں کے کچھ نہیں بچتا۔ اس کے بعد پان تقسیم کئے جاتے ہیں۔ مہمانوں کو میز پوشوں اور پردوں سے ہاتھ پونچھنے پڑتے ہیں اور بر آمدے میں پان کی پیکوں سے گُل کاری کی جاتی ہے۔

پھر سب صوفوں اور آرام کرسیوں پر نیم دراز ہو کر بار بار گھڑی دیکھتے ہیں۔ اچانک ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ "معاف کیجئے، بھابھی کے خالُو رات کی گاڑی سے آنے والے ہیں۔" فوراً ایک اور صاحب خالُو کی بھابھی کا بہانہ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ سب جن کی بھابھیاں اور خالُو وغیرہ نہیں آ رہے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ پھر بھاگڑ مچتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے سینما کا شو ابھی ختم ہوا ہو۔ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے نکل جائے۔ سوائے ان مہمانوں کے جو لفٹ لے کر آئے تھے یا ٹیکسی میں آئے تھے۔ انہیں چھوڑنے کے لئے میزبان کو مختلف سِمتوں میں رات کے ڈیڑھ دو بجے تک چکر لگانے پڑتے ہیں۔ لیکن جب اگلے ہفتے یا اگلے مہینے اس تقریب کے متعلق یوں چھپتا ہے تو پڑھنے والے شاید متاثر ہوتے ہوں لیکن مہمانوں میں سے بیشتر حیران ضرور ہوتے ہیں۔

"پچھلے دنوں شہر کے سوشل جوڑے مسز اور مسٹر ایم-یو-زیڈ شاہین کے ہاں بے حد شاندار اور پُر رونق ڈِنر ہوا۔ شاہینز کو آرائشی سامان کا بڑا شوق ہے۔ تبھی مہمانوں کو ان کا مکان پریوں کا محل معلوم ہو رہا تھا۔

مسز شاہین آپی غرّارہ اور چیتے کی کھال کا کوٹ پہنے مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھیں۔ کھانا حسبِ معمول نہایت لذیذ تھا اور با افراط تھا۔ تکّے کباب کیفے ڈی آغا کے تکّے کبابوں سے زیادہ چٹ پٹے تھے۔ پیاز ٹماٹر کا عجیب و غریب سلاد خود مسز شاہین نے بنایا تھا۔

ایک کونے میں جانی پہچانی سوشل ورکر دُردانہ عارف الدّین جنہیں سب ڈیزی کہتے ہیں، مسٹر قطب الدّین سے مصروفِ گفتگو تھیں۔ ڈیزی نے شلوار قمیض کا نہایت ہی تنگ جوڑا پہن رکھا تھا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ شلوار قمیض کے سمارٹ جوڑے کی پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اسے پہن کر چلنے پھرنے میں کافی دقّت ہو۔ بیٹھ کر اُٹھنا محال ہو اور اُٹھ کر بیٹھنا مشکل۔ سیڑھیاں چڑھنا تو بالکل ناممکن ہونا چاہیے۔ سب خوش ہوئے کہ ڈیزی کے اس چُست لباس میں یہ خوبیاں تھیں۔ ڈیزی بناؤ سنگھار کے جدید ترین طریقوں اور نسخوں سے بخوبی واقف ہیں اور اپنے ساڑھے چار فٹ قد کو بڑی مہارت سے لمبا کر لیتی ہیں۔ بالوں میں ایک گولا رکھ کر اور سر پر گھونسلا سا بنا کر جب مُنہ اُوپر کو اُٹھا کر چلتی ہیں تو اپنے ہائی ہیل جوتوں سمیت ماشاء اللہ ساڑھے پانچ فٹ سے کم معلوم نہیں ہوتیں۔ ڈیزی ان دنوں سارنگی اور پیانو سیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں اور افریقہ یا شاید نیوزی لینڈ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لیکن ہمیں شُبہ سا ہے کہ شاید اس کی نوبت ہی نہ آئے اور چند سالوں تک اُن کی شادی ہی ہو جائے۔

افسوس کہ مسز قطب الدّین غالباً مصروفیت کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہ کر سکیں۔

دوسری طرف مِسز قوّی، جنہیں مُنّی کہا جاتا ہے، اپنی صاحبزادی مِسز لقمان سے جرمن فلاسفروں کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ان کا بیل بوٹوں والا چتکبرا شال سب نے پسند کیا۔ قوّی صاحب بھی آئے ہوئے تھے اور اپنے دائمی نزلے زکام کی شکایت کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے کلچر پر بھی بحث کر رہے تھے۔

ایک کونے میں ننھی یعنی مِسز قلندر اپنی بھتیجی مِسز فریڈی یعنی مِسز فاضل سے کلاسیکی موسیقی پر باتیں کر رہی تھیں۔ مسٹر غوری بڑے غور سے سُن رہے تھے۔

ننھی نے قوسِ قزح کے رنگوں والی ساڑھی پہن رکھی تھی جسے وہ پیرس سے لائی ہیں۔ مِسز فریڈی کی صاحبزادی جارجی یعنی زیتون، ماشاء اللہ کافی خوبصورت ہوتی جارہی ہے اور دیکھتے دیکھتے ایک دم بڑی ہو گئی ہے۔ یہ اب ریڈیو پر مقامی خبریں نشر کرتی ہے۔۔۔۔ اتنی گہما گہمی میں بھی مس لطافت کرم دین یعنی لینا اور مسٹر کرامت کی دلچسپ گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔ مسٹر کرامت ابھی ابھی یہاں آئے ہیں اور اپنی فلسفیانہ باتوں کی وجہ سے بڑے ہر دلعزیز ہیں۔ سُنا ہے کہ گاتے بھی خوب ہیں۔ پچھلے سال ان کی چھوٹی لڑکی بی اے کے امتحان میں اپنے

کالج میں فرسٹ آئی تھی۔ لینا ملگجے لباس اور ریچھ کی کھال کے کوٹ میں بالکل اطالوی دوشیزہ معلوم ہو رہی تھی۔ کھانے کی میز پر شاہینز اپنے ہانگ کانگ کا سفر اور خرید و فروخت کے دلچسپ واقعات سناتے رہے۔

رات کے دو بجے تک پارٹی اس قدر پُر رونق رہی کہ مہمانوں کا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

امید ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ مِکسڈ ڈِنر کیا ہوتے ہیں۔

ویسے ان دونوں لنچ یا ڈِنر کی بجائے ایک اور تقریب بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اسے RECEPTION کہا جاتا ہے۔ اس کا وقت چھ یا سات بجے شام ہوتا ہے۔ جو نہ سہ پہر کی چاء کا وقت ہے اور نہ رات کے کھانے کا۔

البتّہ اس میں سموسے، پکوڑے، چاٹ جیسی چیزوں سے رات کے کھانے سے بیزار کرنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی دو تین تقریبوں میں شرکت ہونے کے بعد یا تو شروع ہی سے معذرت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مجبوراً جانا پڑ جائے تو کھانے کی چیزوں سے دُور رہ کر موقع ملتے ہی بھاگنے کو دل کرتا ہے۔

سوال: آپ کے پرچے میں سر پر بال اُگانے کے سلسلے میں ایک اشتہار کافی دِنوں سے چھپ رہا ہے، جس میں نہ صرف دوائی کی تعریفیں ہوتی ہیں بلکہ سند کے طور پر مستفیض ہونے والوں کے خطوط کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

میں نے بھی اسے استعمال کیا۔ پہلے میرے سر میں تین جگہوں سے تھوڑے تھوڑے بال اُڑے ہوئے تھے، یعنی ہر PATCH بالکل چھوٹا سا تھا۔ لیکن اس تیل کی مالش کے نتائج بے حد مایوس کُن نکلے اور سر کے باقی ماندہ بال بھی جھڑ گئے۔ بتائیے کہ کس سے شکایت کی جائے؟ آپ سے یا تیل بنانے والوں سے؟؟

جواب: ہم سے شکایت بے شک کر لیں، لیکن اگر آپ نے کمپنی والوں کو لکھا تو ہمیں شُبہ ہے کہ کہیں وہ بزنس کے اصولوں کے مطابق آپ کی شکایت کو تعریفی رنگ دے کر کچھ اس طرح نہ چھاپنے لگیں

"پہلے میرے سر پر گنج کے تین PATCHES تھے۔ الحمد للہ کہ آپ کی شہرہ آفاق لاجواب دوائی کی مالش کے بعد اب فقط ایک PATCH رہ گیا ہے۔

سوال: پتہ نہیں لوگوں کو دوسروں کے متعلق افواہیں پھیلانے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ جسے دیکھو اسی تاڑ میں ہے کہ کسی طرح کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جسے مشتہر کیا جاسکے

نہ جانے میں کیوں بالکل مختلف ہوں۔ نہ مجھے پڑوسیوں کے معاملات میں کوئی دلچسپی ہے، نہ دوستوں، واقفوں یا محلّے والوں کے قضیئوں سے کوئی سروکار۔ حالانکہ پڑوس میں ہر سنیچر کی رات کو شیخ صاحب (جنہیں در حقیقت شیخی دکھانے سے نفرت ہے) پتہ نہیں پچاس پچپن کا مجمع کہاں سے اکٹھا کر لیتے ہیں؟ قہقہوں اور چیزیں ٹوٹنے کی آوازیں رات گئے دیر تک آتی رہتی ہیں۔ لیکن مجھے اتنا سا تجسس نہیں ہوتا۔ نہ کبھی میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کرمانی صاحب جو دراصل مدراس کے باشندے ہیں اور دن بھر سائیکل چلاتے ہیں، نہ جانے شام کے بعد ان کے ہاں موٹریں کہاں سے آ جاتی ہیں؟ نہ میں نے محلّے میں یہ تذکرہ کیا کہ مجذوب صاحب نے اپنی دونوں تلخ و تُرش کتابیں دراصل اس اُمید پر چھپوائی تھیں کہ کسی طرح وہ BAN ہو جائیں۔ جب کسی نے بھی نوٹس نہ لیا تو وہ مایوس ہو کر بحرین جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

اور یہ کہ ساتھ والے مکان میں پچاس سالہ مِس دندانی کے ہاں ہر مہینے بھانت بھانت کی پختہ عمر عورتیں کس سلسلے میں جمع ہوتی ہیں؟ کبھی اتفاق سے اس طرف نظر چلی جائے تو سب کی سب ناک بھوں چڑھائے ایک دوسری سے بحث کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور رخصت ہوتے وقت پہلے سے کہیں زیادہ غمگین نظر آتی ہیں۔ اُدھر مِس دندانی نہ جانے اب تک مِس کیوں ہیں؟ اور وہ اس

غمگین گروہ کو "ذہین ہستیوں کا گروپ" کیوں کہتی ہیں؟ میں ان باتوں کا کسی سے ذکر تک نہیں کرتا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ لوگوں کو دوسروں کے معاملوں میں خواہ مخواہ دلچسپی لینے اور افواہیں پھیلانے سے کیا ہے؟

جواب: اپنا سوال دوبارہ پڑھیے، جواب خود مِل جائے گا۔

سوال: ولایت جانے سے پہلے میرے منگیتر کے خیالات بالکل ترقّی پسند تھے۔ لیکن فقط وہاں کے ایک سال کے قیام نے اسے اتنا بدل دیا ہے کہ وہ عورت مرد کی مساوات سے قطعاً مُنکر ہو گیا ہے۔ ہر وقت وعظ کرتا رہتا ہے کہ بیوی کو خاوند کا کہنا ماننا چاہیے۔ بیوی کی جگہ گھر میں ہے کلب میں نہیں۔ غیر مرد سے بات نہیں کرنی چاہیے, وغیرہ وغیرہ۔ ایسی اُلٹی سیدھی باتیں سُن سُن کر تنگ آ چکی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ ایسے مرد سے شادی کر لی تو میری PERSONALITY پر بُرا اثر پڑے گا۔ میرے خیال میں مجھے منگنی توڑ دینی چاہیے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: منگنی مت توڑیئے۔ فی الحال یہی ظاہر کیجئے کہ آپ اس سے متفق ہیں۔ ایک دفعہ شادی ہو لے تو پھر وہ عمل کیجئے جسے ولایت میں NAGGING کہتے

ہیں۔ یعنی بات بات پر بلا وجہ بُرا مان جائیے۔ مُنہ بسوریئے۔ دُور دُور تک خواہ مخواہ خاموش رہیے۔ ناک بھوں چڑھائیے۔ ایک دو آنسو بہا لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں۔

پہلے تو وہ حیران ہو گا۔ پھر جھلّائے گا، رُوٹھے گا۔ بحث کرے گا۔ پھر آہستہ آہستہ سکونِ قلب اور اپنے بلڈ پریشر کی خاطر سیدھا ہو جائے گا اور نہ صرف آپ کا ہم خیال بن جائے گا بلکہ اشاروں پر چلنے لگے گا۔

سوال: انار کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ اس کے فوائد مفصّل طور پر بیان کیجیے۔

جواب: کھانے کے علاوہ انار محبوب کے دانتوں کی تعریف کے سلسلے میں کام آتا ہے۔ اگر صرف ایک انار ہو تو احتیاط لازم ہے کیونکہ اسی حالت میں کہیں سے سو بیماروں کے یک لخت آ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

انار میں ایک بہشتی دانہ بھی ہوتا ہے جسے کھا کر انسان بہشتی بن سکتا ہے۔ (سقّہ نہیں)۔ انار میں دو فیصد اجزائے ملحمہ، ایک فیصد روغنی اجزا۔ نصف فیصد کیلشیم اور لوہا، صفر فیصد وٹامن ہوتے ہیں۔ باقی پانی ہوتا ہے یا اجزائے گٹھلیہ۔ انار کو وجع المفاصل، خفقان، قلّت الدّم (خون کی کمی)۔ دق الاطفال (بچّوں کا دق کرنا) اور سقر بُوط میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی افاقہ ہوتا ہے کبھی نہیں۔

شربتِ انار میں نوّے فیصد پانی اور مٹھاس، دس فیصد سُرخ رنگ۔ ایک آدھ مکھی اور باقی سب انار ہوتا ہے۔

انار جب تُرش ہو (جو اکثر ہوتا ہے) تو دشمنوں اور دوستوں کے دانت کھٹّے کرنے کے کام آتا ہے۔

سوال: میرا چھوٹا بچّہ دن بھر روتا رہتا ہے۔ جب باہر جاتی ہوں یا واپس آتی ہوں تو مکان کے پچھواڑے سے اس کی چنگھاڑیں سُنائی دیتی ہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہوتا ہو گا۔ آپریشن کے علاوہ کوئی اور علاج تجویز کریں۔

جواب: اپنی خادمہ یا بیرے سے دریافت کر کے لکھئے کے بچّے کو کیا خوراک دی جاتی ہے۔ ان سے غذا کے اوقات بھی پوچھ لیجئے۔

سوال: اتفاق سے میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بڑے لاڈوں میں پلی ہے۔ اس کے والد سے جو بالکل ماڈرن ہیں اور ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں کئی مرتبہ شادی کی درخواست کی۔ لیکن وہ بس ایک سوال پوچھتے ہیں۔ ”کیا میری ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی کو سپورٹ کر سکو گے؟“ اس سوال سے ان کی کیا مراد ہے؟ کوئی موزوں جواب بتائیے تاکہ اس مرتبہ چُپ چاپ نہ لوٹوں۔

جواب: جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں۔ غالباً وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ان کی پَلی ہوئی لڑکی کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ پہلے ورزش کر کے خوب چُست ہو جایئے۔ پھر ہمّت کر کے لاڈوں میں پلی ہوئی لڑکی کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر دکھا دیجئے کہ واقعی آپ اسے سپورٹ کر سکتے ہیں۔

سوال: سُسرال والوں نے میری ازدواجی زندگی مکمل طور پر تباہ کر رکھی ہے۔ دو تین سال کے بعد جب بھی کبھار تین چار روز کے لئے سُسرال جاتی ہوں تو وہ میرے خاوند کو سکھا پڑھا دیتے ہیں جس سے بڑی بدمزگی ہوتی ہے۔

آپ کو یا کسی بہن کو کوئی آزمودہ عمل آتا ہو تو مطلع فرمائیں۔

جواب: آپ کا یہ سوال ہم پہلے بھی چھاپ چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی بہن نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ لہٰذا ہم اپنا مشورہ پیش کر رہے ہیں۔

اوّل تو پوری کوشش کریں کہ دو تین برس کے بعد وہ چند دن جو مجبوراً سُسرال میں گزارنے پڑتے ہیں کہیں اور بسر کئے جائیں۔

دوسرے یہ کہ اگر سُسرال جانا ہی پڑے تو خاوند کو ساتھ نہ لے جائیں۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو مندرجہ ذیل عمل تیر بہدف ثابت ہو گا۔

ہفتے میں چار روز تین مرتبہ لا حول ولا قوۃ الّا باللّٰہ پانی پر دم کر کے شوہر محترم کو پلا دیں۔ سردیوں میں وہ پانی نہ پیئے تو چاء پر دم کریں۔ ورنہ صبح صبح پڑھ کر اس کے چہرے پر پھونک دیا کریں۔

فائدہ ہونے تک اس عمل کو جاری رکھیں۔ اس کے بعد کسی اور ضرورت مند بہن کو بتادیں۔

سوال:،ماڈرن مجرّد آرٹ کے ایک شاہکار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا عنوان تھا۔۔"بال سنوارتی ہوئی حسینہ"۔

لیکن تصویر میں نہ حسینہ تھی، نہ زلفیں، نہ کنگھی۔۔۔ غور کرنے پر ایک گھوڑا البتّہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔

جواب: ہم نے بھی یہ تصویر نمائش میں دیکھی ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ کچھ تو نظر آیا۔ ہم تو سالم گھوڑا بھی نہ دیکھ سکے۔ فقط اس کی ایّال کے بال نظر آئے جو غالباً حسینہ کی زلفیں تھیں۔ یہ تجریدی آرٹ کہلاتا ہے، مجرّد آرٹ نہیں۔۔ نوٹ کرلیں۔ اور اس کے شاہکار کو اُلٹار کھنے یا سائیڈ پر ٹانگنے سے ایک اور شاہکار تصویر بن جاتی ہے۔

سوال: میں ہائی سکول میں پڑھتا ہوں، لیکن کورس کی کتابوں کے علاوہ لائبریری کے رسالوں اور کتب کے مطالعے کا بھی شوق ہے۔

آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ ایک طرف تو خودی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، اُدھر ایک بڑے مشہور شاعر نے۔۔ "اگ گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"۔۔۔ کی خواہش ظاہر کی ہے۔

بھلا کس پر عمل کیا جائے؟

جواب: ہم نے آپ کے سوال کے سلسلے میں تین شاعروں، چار نقّادوں اور پانچ پروفیسروں سے رابطہ کیا لیکن وہ اب تک خاموش ہیں۔

جونہی ہمیں کوئی تسلّی بخش جواب ملا فوراً شائع کر دیں گے۔ مطمئن رہیں۔

تعارف

(۱)

محترم جناب فکر تونسوی مدّظلہ, کا دیدار بڑے انتظار کے بعد نصیب ہوا۔ مدّتوں سے تمنا تھی کہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ آخر میرا نصیب اس روز جاگا جب اخبار میں پڑھا کہ وہ ہمارے قصبے میں مشاعرے کی صدارت فرمائیں گے۔

میں نے بڑی محنت کے بعد ایک غزل ''کہی'' پھر اسے کاغذ پر خوشخط لکھا اور کاغذ بغل میں دبا کر (کیونکہ بَس میں اتنی دھکا پیل تھی کہ فقط بغل ہی محفوظ جگہ معلوم ہوتی تھی) پنڈال میں پہنچا۔

مشاعرہ شروع ہوتے ہی مجھ جیسے رنگروٹ شعرا کو ٹرخانے کی کوشش کی گئی۔ جب میرا نام پکارا گیا تو فکر صاحب زاد لطفہ، سے اس قدر مرعوب ہو چکا تھا کہ اپنی غزل کہیں گرادی۔

سٹیج پر پہنچ کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر فقط یہ کہہ سکا۔

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی

تم آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا

اس کے بعد زبان کو جیسے قفل لگ گیا لیکن انہوں نے ازراہِ کرم اُٹھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگریزی میں بولے "THAT WILL DO" —اس کے بعد مزید عنایت ہوئی اور فرمایا کہ جب کبھی تصحیح کی ضرورت ہوا کرے تو جس چیز کو تم اپنا کلام سمجھتے ہو بِلا تکلّف مجھے بھیج دیا کرو۔

چنانچہ آپ تصحیح سے میری شاعری کو دن دُونی رات چوگنی ترقّی ہوئی۔ ان کی بزرگانہ شفقتیں سدا شاملِ حال رہیں اور وہ ہمیشہ لطف و کرم سے نوازتے رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی میں ہوں، محض ان کی عنایت سے ۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس انداز میں کافی طویل مقالہ لکھا جا سکتا تھا مگر یہ سراسر غلط ہوتا۔ کیونکہ نہ تو فکر مجھ سے عُمر میں اتنے بڑے ہیں۔ نہ میں شاعر ہوں۔ اور پھر مدّ ظِلّہ اور زاد لطفہ کے اصلی معنے بھی نہیں آتے۔

نیز یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ دن کے وقت جب سب جاگ کر محنت کرتے ہیں تو فقط دُگنی ترقّی نصیب ہوتی ہے۔ اُدھر رات کو سوتے اور خرّاٹے لیتے ہوئے وہ چوگنی کیونکر ہو جاتی ہے؟

شاید اس میں کوئی رمز ہو۔ اور کسی نے کہا ہے کہ ع رمز رمز ہے اس کی تفسیر مت کر۔

(۲)

برِّصغیر بلکہ برّکبیر کے مشہور دانشور جناب فکر تونسوی کے فن کے متعلق لکھتے ہوئے موزوں الفاظ چُننا آسان کام نہیں۔ پھر بھی (ڈکشنری کی مدد سے پوری کوشش کی جائے گی کہ جہاں تصوّر و تفکّر، تحقیق و کاوش، ادراک و ذکاوت، اظہار و ابلاغ، زاویۂ نگاہ کی جامعیت اور جمالیاتی تصوّرات سے ہم آہنگی، آمد اور آورد، ابعاد ثلاث بعد رابع۔۔۔ جیسے عام فہم الفاظ اس ٹھوس مضمون میں شامل کئے جائیں وہاں ہم عصروں کی تقلید و تتبع، تذبذب اور تذبذب، وحدانیات اور وجدانیات، ابہام کی لذّت، عمق و استدلال کمالیات و جمالیات، تحت الشُعوری کوشش، نرگسیت کی جامعیت جیسے روزمرہ کے جانے پہچانے الفاظ بھی موجود ہوں۔

اور یہ بھی کہ فکر صاحب نے زندگی کی راہ میں کون کون سے مراحل طے کئے؟ اور کیوں کئے؟ وہ تلاش و جستجو کی کِن کِن منزلوں سے گزرے؟ اور کہاں کہاں سے نہ گزر سکے؟ کیا اس لئے کہ اُن منزلوں کا پورا پتہ معلوم نہ تھا؟ اور انہوں نے کس کس جگہ قیام کیا؟ اور کِن کِن مقامات پر قیام نہ کر سکے؟ اور کیوں؟ اور کب؟ اور وغیرہ وغیرہ۔

ایسی چند ہی سطریں لکھی ہوں گی کہ شبہ سا ہو چلا ہے کہ شاید اس قسم کا مضمون اچھی طرح نہ لکھ سکوں۔ اگرچہ بہت چاہتا تھا کہ ان پر ٹھوس اور جامع مقالہ رقم کروں۔

یہ صحیح ہے کہ موصوف پر بہت کچھ چھپا ہے تاہم اسے کم ہی سمجھا جائے کیونکہ جہاں بغیر سوچے سمجھے لکھنا کافی مشکل کام ہے وہاں طرح طرح کی پچاس ساٹھ کتابوں کے حوالے دیئے بغیر تو اور بھی دشوار ہے۔

(۳)

مشاعرہ شروع ہوا ہی تھا کہ ایک شرمیلا سا نوجوان سٹیج پر آیا۔ اس کی غزل کے پہلے دو شعروں پر ہی میں چونک پڑا۔ بقیہ اشعار سُننے پر یقین ہو گیا کہ یہ نو مشق

بہت جلد غضب ڈھائے گا۔ میں نے صدرِ مشاعرہ کی طرف اشارہ کیا جو میری جانب اشارہ کرنے والے تھے۔

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔۔ وہ دن اور آج کا دن، دیکھتے دیکھتے عزیزم فکر نے ایسی ترقّی کی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹنے لگے۔

جس قدر پروپیگنڈہ میں عزیزی کے لئے کر سکتا تھا دل کھول کر کیا اور لگاتار ہمت بھی بندھاتا رہا۔۔۔ حتیٰ کہ چاروں طرف ان کا طوطی بولنے لگا۔

اسے ان کی سعادت سمجھئے کہ جب بھی ان پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برستے ہیں وہ اس خاکسار کو یاد رکھتے ہیں اور یہ بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے کہ جن بلندیوں کو وہ چھو رہے ہیں اس میں مجھ ناچیز کی حقیر کوششیں بھی شامل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی عبارت بھی درست نہیں ہو گی کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے نہیں ہیں، لہٰذا انہیں عزیزی کسی حساب سے نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی طبیعت میں شروع ہی سے انکسار رہا ہے۔۔ اس قدر کہ اگر انہوں نے بھی باقاعدہ طور پر اپنی سوانح عمری لکھی تو اپنے بارے میں کچھ شامل نہیں کریں گے۔ ساری کتاب میں دوسروں کا ذکر ہو گا۔ ویسے بھی ان کی شخصیت یاروں

دوستوں کو عزیز رہی ہے۔ (ایک مرد کے لئے مؤنث صیغہ استعمال کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی کو گلہ ہو تو بجائے راقم الحروف کے اُردُو گرامر سے ہونا چاہیے)۔

اس کے علاوہ بروا کا پودا آج تک دیکھنا نصیب نہیں ہوا لہٰذا اس کے پتّوں کی چکنائی (یا کھُردرے پن) کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ رہ گیا کان کاٹنا تو انہوں نے کسی کے کانوں کو چھوا تک نہیں۔ یہاں تک کہ پالتو بلی یا کتّے کے کان کو بھی نہیں۔ جہاں تک طوطی بولنے کا تعلق ہے تو کہیں بھی وہ طوطی نہیں دیکھا گیا جو کسی انسان کو شہرت ملنے پر بولنے لگتا ہے۔

دوسرے یہ کہ موصوف کو پرندوں سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں۔۔۔ سوائے مرغ، تیتر اور بٹیر کے۔ اور پتہ نہیں وہ بھی رہ گئی ہے یا نہیں۔

اور ڈونگروں کو نہ تو کبھی ساکن حالت میں دیکھا ہے اور نہ برستے ہوئے۔ بلکہ یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ ہوتے کیا ہیں۔ بہر حال محاورے پر محاورے ہیں۔

(۴)

رفیقِ دیرینہ فکر تونسوی صاحب سے بڑی پرانی دوستی ہے۔۔ تب سے جب میں پنجاب کے جنوبی حصّے میں مویشی گننے کے عہدے پر فائز تھا۔ اُنہی دنوں دورے

پر ایک قصبے میں گیا تو ایک دکان پر پھر تیلے سے نوجوان کو دیکھا جس سے دکاندار بڑے ادب سے پیش آرہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ اس علاقے کے مشہور شاعر فکر تونسوی ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ مجھے اچھے اشعار سُننے کا شوق رہا ہے تو فکر نے مجھے لسّی پینے کی دعوت دی جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ پھر باتوں باتوں میں کہا کہ اگر وہ ان حضرات سے بات چیت کرا دیں جو ڈیوٹی کے سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہوں تو ممنون ہوں گا۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے متعلقہ لوگوں سے ملایا۔ فکر کی ذہانت اور سوشل رکھ رکھاؤ سے میں بہت متاثر ہوا۔

پھر چلتے وقت انہوں نے مشورہ دیا کہ حیوانات کی بجائے اگر میں انسانوں کی طرف رجوع کروں تو مستقبل بہتر ہو سکتا ہے۔(یعنی میرا مستقبل)

یہ تھی فکر سے پہلی ملاقات۔

چنانچہ میں نے رات دن ایک کر کے بی اے کیا۔ بعد میں جب سات آٹھ برس کے بعد بسوں کے اڈے پر ان سے مختصر سی ملاقات ہوئی تو میں ایم اے کر چکا تھا۔

بہتر سے بہترین کی طلب مجھے اور آگے لے گئی اور کمرِ ہمّت باندھے بغیر (کیونکہ مجھے علم نہ تھا کہ کمر کس طرح باندھی جاتی ہے) مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ فکر صاحب نے برسوں پہلے جو مشورہ دیا تھا اس کی بنا پر کامیاب ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد جب اُن کے ضلع کا افسر بن کر اُن کے قصبے میں گیا تو انہیں یاد رکھا۔ شام کے کھانے پر ریسٹ ہاؤس میں بلانا چاہتا تھا کہ کسی نے بتایا کہ وہ ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر بن کر لاہور جا چکے ہیں اور اب نثر نگاری شروع کر دی ہے۔

مزید ترقّی کے سلسلے میں جب تگ و دو کر رہا تھا تو لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنا نوکر اُن کے دفتر بھیجا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس وقت باہر گئے ہوئے ہیں۔ غالباً لنچ کے سلسلے میں۔

پھر انہیں ایک ریلوے جنکشن پر دیکھا۔ میں ان کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ٹرین چلنے لگی اور مجھے فوراً واپس بھاگنا پڑا۔ جب میری ترقّی ہوئی تو انہیں خط لکھا جو شاید ڈاکیے نے کھو دیا۔ اس کے بعد ایک وفد کے ہمراہ مجھے چند ہفتوں کے لئے سمندر پار بھیجا گیا۔ مختلف مقامات پر جو کانفرنسیں ہوئیں وہ بے حد اہم تھیں۔ لیکن فکر مجھے ہمیشہ یاد رہے اور وہاں سے انہیں رنگ برنگے پکچر پوسٹ کارڈ بھیجے۔ غالباً

شدید مصروفیت کی وجہ سے وہ ان کا جواب نہ دے سکے یا شاید میں پورے ٹکٹ نہ لگا سکا۔

واپسی پر ائیر پورٹ کے ایک حصّے میں دُور ایک صاحب نظر آئے جو فکر لگتے تھے میں فوراً اُن کی جانب لپکا لیکن وہ ہجوم میں غائب ہو چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ شاید وہ فکر ہی تھے۔

اعلیٰ کارکردگی پر جب مجھے اعزاز ملا تب بھی انہیں یاد رکھا ایک شخص کے ہاتھ مٹھائی اور خط انہیں بھیجے جس کے جواب میں رسیدی پوسٹ کارڈ آیا۔ ان کی اس کرم فرمائی پر خوشی دوبالا ہو گئی۔

جب میرے مکان کی تعمیر شروع ہوئی تو انہیں اطلاع دی۔ ایک کارڈ پھر آیا جب میں نے سستے داموں میں دوسرے مکان کے لئے زمین خریدی تو اُنہیں۔۔۔ جب میں دوبارہ سمندر پار گیا تو اُن کو۔۔۔ جب میں نے یہ کیا۔۔۔ جب میں نے وہ کیا۔۔۔ اس کے علاوہ میرا۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں۔۔

اس مقبول سٹائل سے بھی یہ خاکسار احتراز کرے گا کیونکہ اوّل تو اس میں "میں ہی میں" ہے۔ فکر صاحب بیک گراؤنڈ سے بھی عقب میں ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ سب کچھ قطعاً نہیں ہوا تھا۔

(۵)

میں اور میرا ہم جماعت کُلّو اور کانگڑے کے خوشنما علاقے کی سیر سے واپس آ رہے تھے۔ پٹھان کوٹ سے ہمیں جو ٹرین ملی وہ اتنی سُست رفتار تھی کہ لاہور صبح چار بجے پہنچی۔۔۔یا شاید وہ صحیح وقت پر آئی ہو اور ہم ٹائم ٹیبل صحیح طرح نہ دیکھ سکے۔ اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ قصور کی پسنجر ٹرین میں ابھی چھ سات گھنٹے باقی ہیں۔

سوچنے لگے کہ تب تک کیا کیا جائے؟

بے وقت ناشتہ کرنے کا خیال آیا لیکن جب بٹوے نکال کر روپے آنے اور پیسے گنے تو لودھراں تک کے دو تھرڈ کلاس ٹکٹوں جتنی رقم تھی۔ (لودھراں سے بہاولپور فقط چند میل دور ہے لیکن بیچ میں دریائے ستلج حائل ہے)۔

یکایک میرے دوست کو وہ خط یاد آ گیا جو میں نے پہاڑوں وادیوں کے جلال و جہاں سے متاثر ہو کر فکر تونسوی صاحب کو بھیجا تھا۔

”فکر صاحب مشہور اہلِ قلم ہیں تو کیوں نہ ان کے ساتھ صبح منائی جائے؟“ اس نے پوچھا۔

"ادبی شخصیتوں کے ساتھ شام منائی جاتی ہے۔ وہ بھی اُن کی اجازت کے بعد۔ آج تک نہیں سُنا کہ کسی کے ساتھ صبح منائی گئی ہو۔"

"شام کو تو وہ کئی سوشل تقریبوں میں مصروف ہوتے ہوں گے۔ دن بھر رسالے کے دفتر میں کام رہتا ہو گا۔ لہٰذا صبح ہی وہ وقت ہے جب۔۔۔"

"مگر صبح ہونے میں تو ابھی دیر ہے۔۔"

"تو پھر صبحِ کاذب یا صبحِ صادق منانے میں تو اور بھی جدّت ہو گی۔ بالکل نئی چیز ہے۔ لہٰذا ترقّی پسندی میں شامل ہو گی۔"

محض اُس کے اصرار پر مجبور ہو کر (اور چند میل پیدل چل کر) فکر صاحب کے گھر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

پھر میرے دوست نے یہی عمل بڑی سرگرمی سے اس وقت تک جاری رکھا جب تک پڑوسیوں نے شور نہیں مچایا۔ اس پر دروازہ کھلا اور بیشتر اس کے فکر یہ سمجھ سکتے کہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کون ہیں میرے دوست نے اُردُو شاعری کے جدید رجحانات کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کا کمرہ چار دیواروں، ایک فرش، ایک کُرسی، چھت دروازوں، میز، دو کھڑکیوں اور ایک بلّی سے مزین تھا۔

اُن کا اونگھتا ہوا ملازم ہمارے لئے دو دو چھٹانک کی ہلکی ماڈرن کُرسیاں لایا، جن پر ہم بیٹھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ وہ چبھتی تھیں۔ میز پر بیٹھنا زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے بعد وہ دروازے کھڑکیاں بند کر کے دیر تک ان چیزوں کو جلانے کے لئے ہوا دیتا رہا جنہیں وہ کوئلے سمجھ رہا تھا۔ اس کے پنکھے کی متواتر گردش سے کمرے کا ٹمپریچر نقطۂ انجماد تک پہنچ گیا ہو گا۔ اس کا ثبوت وہ چھینکیں تھیں جو ہم سب کو دبا دب آرہی تھیں۔ اُدھر فکر صاحب جمائیاں بھی لے رہے تھے اور جاگنے کی کوشش میں بھی مصروف تھے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ شاعری اور نثر میں کیا فرق ہے؟ تو انہوں نے انتہائی تحمّل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سوال کی وضاحت کی جائے۔ میرے دوست نے اپنا سوال دوہرا کر کہا۔ ”نیز یہ کہ آزاد شاعری اور نثر کو الگ الگ کرنے میں کبھی کبھی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔“

اُنہوں نے جواب دیا کہ شاعری اور نثر میں پہلا فرق تو یہ ہے کہ غزل ہو یا نظم، کاغذ پر تحریر کرتے وقت ”لکھی نہیں جاتی“ بلکہ ”کہی جاتی ہے“۔ دوسرے یہ کہ شاعری کا ہر مجموعہ دیوان کہلاتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بارہا سوچا بھی کہ اگر یہ دیوان ہے تو ریاستوں میں نواب یا راجہ کے معتمد خاص کو دیوان صاحب کیوں کہا جاتا ہے؟ تیسرے یہ کہ آزاد ہوتے ہی جہاں شاعری ساری زنجیریں توڑ چکی ہے وہاں نثر کو نہ جانے کیوں آزادی نہ مل سکی۔ یہ اب تک غلامی میں پھنسی

ہوئی ہے۔ چوتھے یہ کہ کسی فُل سکیپ کاغذ پر پہلے عبارت لکھ دیں پھر کاغذ کو نصف تہہ کر لیا جائے تو شاید داہنی طرف کے فقروں سے ایک آزاد نظم وجود میں آسکتی ہے اور بائیں جانب کی سطروں سے دوسری۔

اتنے میں اُن کا ملازم کسی دکان سے ایک جانی پہچانی چائے لایا جس میں سب کچھ پہلے ہی سے ملا ہوا تھا اور جسے پیتے ہی ہم سب ہڑبڑا کر اُٹھے۔

فکر نے فوراً چونک کر کہا کہ جہاں غزلوں کے اشعار ہارمونیم اور طبلے پر گائے جاتے ہیں، وہاں آزاد نظم کے مصرعوں کا کوئی ساز ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہاں تک کہ غیر ملکی موسیقی کا کوئی آلہ، مثلاً ٹرومبون، یوفونیم، یوکلیلی وغیرہ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ جہاں شاعری میں دوغزلہ، سہ غزلہ بلکہ چار غزالہ تک کی کھُلی اجازت ہے، وہاں نثر مین دو مضمون سہ انشائیہ یا چار افسانہ لکھتے وقت جھجک محسوس ہوتی ہوگی۔

باتوں باتوں میں یہ احساس ہی نہ رہا کہ ٹریفک شروع ہو چکا ہے۔ سڑک سے طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں اور کھڑکی سے سورج کی شعاعیں۔

دفعتاً ایک گرجدار صدا سنائی دی:

ہیں پکاریں ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے

اِدھر آ بے، اَبے او چاک گریباں والے

اس پر ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ پھر دبنگ نعرہ لگا جو کسی بادشاہی سُرمے یا اصلی شہنشاہی چیز کے اشتہار کے بارے میں تھا۔ ”ع کیا یہ کُنڈلی مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا“

پھر یہ شعر نازل ہوا۔

”مرتے مرتے ہم بچے اور خیر کی اللہ نے !

رات بھر چوٹی سمجھ کر سر مروڑا سانپ کا“

اس پر میرے دوست نے پوچھا کہ جب غلط فہمی کے تحت سانپ کا سر مروڑا جا رہا تھا تو اس نے احتجاج کیوں نہیں کیا۔۔ کاٹ لیتا یا دوڑ جاتا۔

موصوف نے فرمایا کہ کوئی صاحبِ دل سانپ ہو گا جو رواداری میں وہیں بیٹھا رہا۔ پھر آپ نے چٹکی بجائی اور ملازم حلوائی کی دکان سے گرم گرم حلوہ لے آیا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں۔

میرے دوست نے اُس بے انصافی کا ذکر کیا جو مغربی دانشور مشرق والوں اور خصوصاً جنوب مشرق والوں سے روا رکھتے ہیں۔ یعنی ان کے ہر کارنامے کا

CREDIT خود لے لیتے ہیں۔ اس پر فکر صاحب نے جنوب مشرقی جیو میٹری، جنوب مشرقی ELECTRONICS، جنوب مشرقی سرجری اور آئن سٹائن کی جنوب مشرقی تھیوری پر ہلکی سی روشنی ڈالی اور ملازم کو ایک خاص اشارہ کیا جسے وہ ضرور سمجھ گیا ہو گا کیونکہ اس نے فوراً یاد دلایا کہ آج رسالے کے دفتر میں کانفرنس ہے لہٰذا انہیں جلدی پہنچنا ہو گا۔

اس طرح یہ انٹلکچوئل محفل ختم ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسی داستان جو طویل بھی کی جا سکتی ہے، شاید ماڈرن قدروں کے عین مطابق ہو، لیکن در حقیقت یوں بالکل نہیں ہوا تھا۔

بھلا دو معمولی طالبِ علم ایک مشہور رسالے کے مدیر سے اتنی بے تکلّفی کیوں کر برت سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسے حالات میں کسی بھی مدیر کا اتنا صابر اور متحمّل ہونا بہت مشکل ہے۔

(ویسے اس سے ملتا جُلتا واقعہ پیش ضرور آیا تھا لیکن ادبی سلسلے میں نہیں بلکہ اکھڑ قسم کے حالات میں۔ اور وہ بھی میرے دوست کے دوستوں کے ساتھ)

(٦)

راقم الحروف نے اب تک محقّقانہ انداز میں کچھ نہیں لکھا۔

قارئین اور سامعین دونوں کے لئے یہ امر باعث مسرّت و بہجت ہو گا کہ خاکسار نے جس کاوش اور چھان بین سے فکر صاحب کے طنز و مزاح پر ایک عظیم مقالہ لکھنے کا مصمّم ارادہ کر رکھا ہے۔ اُمّیدِ کامل ہے وہ خود اس موضوع پر ایک گراں قدر تصنیف بن جائے گی اور اس میں ایسے ایسے انوکھے زاویوں سے موضوع اور متعلقہ اجزا کو پرکھا جائے گا کہ اس سے مستفیض ہونے کے لئے خاص ذوق، ذہانت و دیگر لوازمات ضروری ہوں گے۔ پوری کوشش کی جائے گی کہ اسے جس قدر SYMBOLIC یعنی اشارتی بنایا جا سکے دریغ نہ کیا جائے تا کہ محض انٹلکچوئل طبقے کے لئے خاصے کی چیز ہو۔

اور اگر دوسرے اسے OUT OF BOUNDS سمجھیں تو سمجھا کریں۔

سب جانتے ہیں کہ ادب کو اشارتی بنانے میں خاصی دشواریاں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے:

بیکار نالے صُورتِ بلبل کئے تو نے

کس سے کہیں کہ گُل کی سماعت میں فرق ہے

سالم مقالہ تو طوالت کی وجہ سے یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا لیکن TRAILER یعنی نمونے کے طور پر کہیں کہیں سے چند حصّے پیش ہیں:

انسان کا خیال ہے کہ وہ کائنات کا محور ہے اور اس کی اپنی ذات کے اندر بھی کائنات موجود ہے، تبھی اس نے اپنے لئے اشرف المخلوقات کا لقب چُنا ہے۔ غالباً اس لئے کہ دیگر جاندار (سوائے طوطے کے) بول نہیں سکتے اور نہ (طوطے سمیت) لکھ سکتے ہیں۔

فکر صاحب کے فن کی تشریح سے پہلے اگر ہنسی، ہنسنے کے عمل، ہنسی کی حد، ہنسوڑ پنے کے درجے، قہقہوں کی اہمیت۔۔۔ وغیرہ کی وضاحت کر دی جائے تو بہتر ہو گا۔ یعنی "دل ہی دل میں لڈّو پھوٹنا" (خواہ پڑھنے والا سوچتا رہے کہ لڈّو دل میں کیسے پہنچ گئے)۔۔ "باغ باغ ہو جانا" (خواہ چاروں طرف ریگستان ہو)۔۔ "زیرِ لب (اور اگر مونچھیں ہوں تو زیرِ مونچھ) مُسکرانا۔۔ باچھیں کِھل جانا (بیشتر لوگوں کو باچھیں کے معنے معلوم نہیں، تبھی وہ کِھل جانا کہ جگہ کھُل جاتا پڑھتے ہیں)۔۔ بتّیسی دکھاتا (خواہ سارے دانت مصنوعی ہوں)۔۔ بغلیں بجانا (اپنی بغلیں)۔۔ وغیرہ کی کیا نوعیت ہے اور ان سب میں کتنا فرق ہے۔ اس دیباچے کے شروع میں بیان کیا جائے گا۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب (غریب کی جگہ شاید امیر بہتر ہوتا) کیفیت کا تجزیہ ہو گا کہ انسان کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ہنسے، جبکہ دیگر جاندار۔۔ یعنی چرند، پرند، درند۔۔۔ سنجیدہ رہتے ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے بھی تقریباً

تیس چالیس صفحات درکار ہوں گئے۔ مزاح کی اصناف۔۔۔ مثلاً ٹھٹھول بازی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، دِل لگی، ضلع جگت، برجستہ گوئی، پھکّڑ پن، ضحک لفّاظی۔۔۔۔ وغیرہ کا تذکرہ مقالے کے وسط میں ہو گا۔

پھر یہ کہ اُردُو میں جتنا بھی مزاح ہے اس کا اثر ہم پر عملی طور پر کیوں نہ پڑ سکا؟ ہنس مُکھ قوموں کی شگفتہ مزاجی سے متاثر ہونے سے ہم کیوں معذور رہے ہیں؟ اور معذور رہنے کے لئے ہم نے کیا کیا جتن کئے اور کیسے کیسے بہانے بنائے؟

اس پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔(ممکن ہے کہ وہ کچھ دھندلی سی ہو کیونکہ بقول انگریزوں کے AGNORANCE IS BLISS۔

اس سے اگلے حصّے میں سنجیدہ نثر اور مزاحیہ نثر میں فرق معلوم کرنے کے مفید گُر بتائے جائیں گے۔

بعد میں ادبی مزاح اور صحافی طنز کے مدغم ہو جانے سے پبلشرز اور نقّادوں کو جو فائدے ہوئے اور جن انجمنوں نے سر اُٹھایا۔ اُن کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر پیچیدگیوں پر لمبا تبصرہ کیا جائے گا جو پیدا نہ ہو سکیں۔

قبل از مسیح کے طنز و مزاح کا بھی ذکر ہو گا۔

مثلاً بابل اور نینوا کے کھنڈرات میں جو انسان نما حیوانوں کے مجسمے ملے ہیں اُن کی مونچھیں داڑھیوں سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ جو محاورے کے سراسر خلاف ہے۔ اور یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا ہنس رہے ہیں، کیونکہ چہرہ بالوں سے بھرا ہوا ہے۔

اُدھر مصنوعی داڑھی لگانے والے فرعونوں کے مقبروں میں مصریوں کی تصویریں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ مطمئن تو شاید ہوں لیکن مسرور نہیں معلوم ہوتے۔ شاید اس لئے کہ اُنہیں علم ہو گا کہ جونہی صحرا کی طرف سے بادِ سموم چلی تو مصنوعی داڑھی کے ہلنے اور گر جانے کا امکان ہو سکتا ہے۔

یونانیوں کے عہدِ زرّیں میں اداکاری بالکل کھُلے ہوئے لیکن بغیر چھت کے تھیٹروں میں ہوا کرتی۔

چنانچہ اداکار اور تماشائی دونوں کچھ ڈرے ڈرے سے رہتے۔ یعنی دھوپ میں پسینے سے شرابور۔ اور اگر شام کو بارش ہو جائے تو سب کے تہمد نما کپڑے بھیگ جائیں۔ سردیوں میں ایسے لباس میں خوب ٹھنڈ لگتی ہو گی۔ تبھی ان کے طربیہ ڈرامے اتنے طربیہ نہیں لگتے جتنی کہ اس خوشنما علاقے کے زندہ دِل لوگوں سے توقع رکھی جا سکتی تھی۔

رومن آئے تو حیوانوں، انسانوں کی لڑائی میں تینوں متعلقین۔۔۔ جانور، لڑنے والے اور تماشائی۔۔۔ سب کو سنجیدہ ہونا پڑا۔

لیکن چند رنگیلے رومن حکمرانوں نے بعد میں محفلِ رقص و سرود منعقد کرا کے سنجیدگی اور ہنسی کو برابر برابر چھڑانے کی کوشش ضرور کی۔

پھر جو تہذیبیں آئیں۔۔۔ اور وہ تہذیبیں بھی جن کے متعلق ہماری معلومات کم ہیں، ان کے بارے میں ستّر اسّی صفحات کے لگ بھگ۔

پھر تقریباً پچاس صفحات میں اس گتھّی کو سائنٹیفک طریقے سے سلجھایا جائے گا کہ انسان سارے سنجیدہ جانداروں کے سامنے ہنس ہنس کر خواہ مخواہ اپنی پوزیشن کیوں آکورڈ کراتا ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن شاید راقم الحروف یہ سب کچھ پوری تفصیل سے نہ لکھ سکے۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کم سے کم کتنا کافی مشکل کام ہے۔ اس کے علاوہ اگر مضمون اور طویل ہو گیا تو THESIS کہلانے کا مستحق ہو گا جسے پی ایچ ڈی کے لئے بھیجا جا سکتا ہے۔ ڈگری ملنا نہ ملنا اور بات ہے لیکن یہ خاکسار پہلے ہی سے ڈاکٹر ہے۔ اور ڈبل ڈاکٹر بننا کسی کسی کا کام ہے۔

(۷)

دانشوروں کی شروع کی زندگی کی تگ و دَو اور طرح طرح کے اُلٹے سیدھے تجربوں کا ذکر نہ صرف پسند کیا جاتا ہے۔ بلکہ کچھ شبہ سا ہے کہ موجودہ دور میں پڑھنے والے اس کی توقع بھی رکھتے ہیں۔

اوائل عمر میں ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ فکر صاحب نے ٹیوشن بھی کی (یعنی دوسروں کو پڑھانے کی کوشش کی) ایک فل ٹائم ٹیکنیکل ڈیپارٹمنٹ میں پارٹ ٹائم کام بھی کرتے رہے۔ پھر بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بنے، لیکن اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ جب مینجر کو معلوم ہوا اور اس نے پالیسی لینے پر اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ شروع سے میرا عقیدہ یہی رہا ہے کہ HONESTY IS THE BEST POLICY۔

اس کے بعد دیہات سدھار محکمے میں شریک ہوئے اور کئی بڑے بڑے شہروں کی سجاوٹ میں مزید اضافہ کیا۔

اس کے بعد جب آپ ریڈ کراس میں تھے تو حسبِ معمول ایک مُنہ بولے دوست نے آپ کو ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی لیکن فریقین میں سے کسی کو کامیابی نہ ہو سکی۔

پھر آپ کو LIPTON کی چاء (بہت سے لوگ جسے لپٹن کی چاء بھی کہتے ہیں) کے نمائندے کی حیثیت سے لنکا کے دورے کی دعوت دی گئی، لیکن دفتری کاروائی اور VISA وغیرہ میں اتنی دیر لگ گئی کہ تب تک لنکا، سری لنکا بن چکا تھا۔

مختصر عرصے کے لئے آپ کو ایکٹنگ کرنے کو موقع بھی ملا۔ لیکن میک اپ کرتے وقت چہرے پر جس قسم کی چیزیں تھوپنی پڑتی ہیں اور آسانی سے اُترتی ہی نہیں، ان کی وجہ سے ہیرو بننے کا خیال چھوڑ دیا۔

بعد ازیں ایک کمرشل بینک کے مینجر بنے اور پھر بلڈ بینک کے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہلّہ بھی ناکام رہے گا۔ کیونکہ ان کے ساتھی فوراًاس کی تردید کر دیں گے کہ فکر صاحب نے ایسی یا اس قسم کی اور حرکتیں بالکل نہیں کیں۔

رہ گیا تجربہ۔۔۔ اس کے حصول کے لئے سب تلقین کرتے ہیں اور بار بار اس کی اہمیت دوہرائی جاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کوشش میں ایسے ایسے تجربے

بھی ہو جاتے ہیں کہ انسان لا حول پڑھتا ہے اور اس قسم کے ہونّق تجربے سے پہلے وہ کہیں بہتر تھا۔

(۸)

تعارف نویسی کی یہ چند کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

سوچ رہا ہوں کہ جب وہ مدیر تھے کیوں نہ ان دنوں کے واقعات اور باتوں کا ذکر کیا جائے۔ ان کا جس مشہور رسالے سے واسطہ تھا، اس کے دفتر میں سہ پہر سے رونق شروع ہو جاتی جو دیر تک رہتی۔ اور ایسے ایسے ادبی V.I.P اکٹھے ہوا کرتے کہ فقط ہم جیسے چند نو مشق (جو تعلیم کے دباؤ کی وجہ سے محض کبھی کبھار وہاں جا سکتے) ہی کو V.U.Ps یعنی (VERY UN-IMPORTANT PERSONS) کہا جا سکتا تھا۔

ادبی (اور غیر ادبی) گفتگو میں چھیڑ خانیاں ہوتیں۔ قہقہے لگتے۔ اور یہ عمل جسے انگریزLEG PULLING کہتے ہیں اس کا مظاہرہ عام ہوتا۔

مثال کے طور پر ایک صاحب آئے جو چند پبلشرز کی مطبوعہ کتابوں کی تعریف میں اشتہار، گرد پوش کی عبارت وغیرہ لکھتے اور معاوضہ وصول کیا کرتے۔ اُن پر کسی نے چوٹ کی کہ جو شخص ہر افسانہ نویس، شاعر، مضمون نگار کی تصنیف پر

زمین آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے، کاش کہ وہ اپنے مقرر کئے ہوئے معیار پر ایک چھوٹا سا کتابچہ ہی خود لکھ کر دکھا دے۔ انہی دنوں ایک نقّاد نے ریویو میں لکھا: "اگلے ایڈیشن کے لئے (اگر وہ کبھی چھپا) یہ پُر خلوص مشورہ پیش ہے کہ مصنّف اس بے حد طویل اور فالتو تعریفوں سے لبریز دیباچے پر ہی اپنی کتاب ختم کر دے اور اس کے بعد جو کچھ خود لکھا ہے اسے قطعاً حذف کر دے۔"

اسی طرح ایک دفعہ فکر کی شاعری کے ساتھ ساتھ جب ان کی مزاحیہ تحریر چھپی تو کئی حضرات چونکے۔ ان کے دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ مزاحیہ تحریر بھی انہی کے قلم سے ہے۔ اس پر ایک صاحب نے یہ لکھا: "جناب فکر تونسوی کے قلم سے۔۔۔ یعنی قلم واقعی فکر ہی کا تھا لیکن اس تحریر کے لئے استعمال کسی اور نے کیا۔"

تازہ مطبوعات کا تذکرہ ہوتا تو اس قسم کے فقرے سُننے میں آتے:

"اس مجلّد پیکٹ کے متعلق فقط یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک کتاب ہے جس کی واحد خوبی یہ ہے کہ کسی نے اسے چھاپ دیا ہے۔ رہ گیا اس کا ادبی پہلو۔۔۔ سو کاغذ اچھا خاصا ہے اور قیمت واجبی ہے۔"

یا۔۔۔ ”مصنّف کی کتاب کا پہلا ایڈیشن سچ مچ ایک ہزار جلدوں پر مشتمل ہے۔ کسی کو شُبہ ہو تو پبلشر کے گودام میں جا کر خود گِن لے۔“

یا۔۔۔ ”اس مجموعے کے شروع میں یہ نوٹ ضرور ہونا چاہیے کہ جو کچھ مصنّف نے اس میں لکھا ہے اس سے اس کا متفق ہونا ضروری نہیں۔“

اور۔۔ ”سارے ناول میں فقط ایک صفحہ ہے جو قابلِ آفریں ہے۔ وہ ہے ناول کا اختتام۔ جب پڑھنے والا اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ شکر ہے اس سے چھٹکارا ملا۔“

یا پھر۔۔۔ ”میں نے اس کتاب کو لگاتار پڑھ کر رات کے چار بجے ختم کیا، جس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان دِنوں میرے شب و روز کس قدر پھیکے اور بے کیف گزر رہے ہیں۔“

اور۔۔۔ ”اس شاعر کا مستقبل خاصہ روشن نظر آتا ہے۔ لیکن شاعری میں نہیں بلکہ ٹھیکیداری، وثیقہ نویسی، دکانداری وغیرہ میں۔۔“

اس پر موزوں جواب بھی دیئے جاتے۔ اکثر تو ایسے ہوتے جو سراسر ناقابلِ اشاعت تھے۔ ایک جغادری دانشور (پہلی مرتبہ یہ لفظ سُنا تو جگادھری لگا) جن کا رویّہ کچھ یوں تھا کہ۔۔۔ ”مسوّدے میں جو کچھ میں نے نہیں پڑھا وہ پسند نہیں

تھا۔۔ جو کچھ نظر انداز کیا وہ اچھا نہیں لگا۔ اور بقیہ جس حصّے پر نشان لگائے یعنی جسے جوں کا توں رہنے دیا ہے اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ چونکہ یہ ایک نئے لکھنے والے کی تحریر ہے اس لئے میں مدیر کو بد ظن نہیں کرنا چاہتا۔ اگر وہ چاہے تو بے شک چھاپ لے۔" انہوں نے خود کچھ تخلیق نہیں کیا تھا، مگر ان کی تنقید اور کاٹ 3-DIMENSIONAL تھی۔

نکتہ چینی کرتے وقت یہ لکھنے والے کی پرانی نگارشات پر حملہ آور ہوتے۔ انہیں شکست دے کر اس کی موجودہ تخلیقات کو ڈھا دیتے۔ پھر اس کے مستقبل پر بھی فاتحہ سی پڑھ دی جاتی۔ اگر مصنّف احتجاج کرتا کہ جو میری تحریریں وجود ہی میں نہیں آئیں، جنہیں ابھی تک لکھا ہی نہیں، ان میں مَیں نے غلطیاں کیسے کر دیں تو جواب ملتا۔ "کدی تے کروگے۔"

یہ چھوٹا سا فقرہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔ چنانچہ ایک وی آئی پی ادیب سے وضاحت چاہی۔

انہوں نے بتایا کہ "ریاستوں، راجوڑوں میں افراتفری کے زمانے میں کسی عہدے دار نے محض شُبے پر کسی کو پچاس روپے جرمانے کی سزا دی۔ اس زمانے میں پچاس روپے کی قیمت کافی ہوا کرتی تھی۔ وہ فوراً گیا اور پڑوس کے شہر سے چند گواہ لایا جنہوں نے الزام غلط ثابت کر دیا اور حلفیہ بیان دیا کہ واقعے کے

وقت یہ شخص یہاں سے سو میل دُور ہمارے پاس تھا۔ اس پر جواب مِلا کہ اچھا مان لیا کہ اس نے قصور نہیں کیا۔ اب تم سب جا سکتے ہو۔"

لیکن وہ شخص وہیں کھڑا رہا۔

"تم کیوں کھڑے ہو؟"

"میرے پچاس روپے واپس کئے جائیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے قصور نہیں کیا۔"

"اوئے کدی تے کرو۔" کہہ کر عہدے دار نے کیس ڈسمس کر دیا۔

ہفتہ وار پرچوں میں کبھی کبھی چند ادبی شخصیتوں کی پینے پلانے کی محفلوں کا ذکر چھپا کرتا۔ لیکن ان میں بھی فکر کا نام بطور تماشائی بھی نہیں شامل ہوا۔

فکر کا نظریۂ حیات کچھ ایسا رہا کہ:ـ

پانی پی پی کے توبہ کرتا ہوں

پارسائی ہی پارسائی ہے

جب شہر کے غل غپاڑے سے جی اُچاٹ ہو جاتا تو اپنے آبائی قصبے اور اس کے مضافات کا چکر لگاتے۔ یہ غالباً۔

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست

در بیاباں می تواں فرہاد خاطر خواہ کرد

کے سلسلے میں ہوتا ہو گا۔

ویسے رسالے کے دفتر میں شام کی محفلوں کے علاوہ دن بھر لوگ آتے جاتے رہتے لیکن فکر ہر قسم کی گہما گہمی میں بھی اپنے کام میں جُٹے رہتے۔ انہیں یہی دُھن رہتی کہ رسالے کا معیار اور بلند ہو۔ ذاتی رابطے سے اور لگاتار خط و کتابت کے ذریعے کوشش کرتے کہ ہر نئے شمارے کے لئے اچھے سے اچھے مسوّدے مل سکیں۔

اچھے مواد کی اہمیت کے سلسلے میں شاید کسی نے اس زمانے کے اطالوی ڈکٹیٹر کا یہ بیان اُنہیں پڑھا دیا ہو گا۔ مسولینی نے کھُلم کھلا اعلان کیا کہ۔۔۔ ”جب مجھے لڑنے کے لئے اٹلی سے صحیح قسم کا مواد ہی نہیں مل رہا تو میں فتوحات کیونکر حاصل کروں؟ سوچئے تو سہی کہ اگر مائیکل اینجلو جیسے عظیم فنکار کو سنگِ مَرمَر نہ

مِل سکتا تو کیا اس کے شاہکار مجسّمے ظہور میں آتے؟ اگر اسے محض سادہ گارا ملتا تو وہ ایک اچھا ظروف ساز بن سکتا تھا بس۔"

فکر صاحب شروع سے میانہ رَو رہے، تبھی انہوں نے مُدّیری کا دَور بڑی عمدگی سے نبھا دیا۔ بہت سارے دوست بنائے۔ کئی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

ایک صاحب نے جو دفتر میں ان کے ساتھی تھے کہا کہ ہر متنازعہ اور حُجّتی معاملے پر کچھ کہنے سے پہلے فکر صاحب دو تین مرتبہ سوچتے تھے اور پھر کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔

موجودہ دور میں کارکردگی کو SCORE میں بیان کرنے کا رواج ہو چلا ہے۔ لہٰذا فکر کی شاعری، ایڈیٹری، مزاح نویسی اور کالم نگاری۔۔۔ ان سب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کا سکور 4-6 ,4-6 ,4-6 ,5-6 کے لگ بھگ رہے گا۔

معیاری رسالوں کے مدیروں کی خوب خوشامد کی جاتی۔ عموماً کچھ اس قسم کے فقروں سے۔۔۔ "آپ تو ہمیشہ صداقت کے علم بردار رہے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ خوشامد کو تو آپ قطعاً پسند نہیں کرتے۔"

فکر ایسے جملوں پر یا تو چھینکنے لگتے یا کھونسنا شروع کر دیتے۔

اسی طرح ادبی حلقوں میں عموماً "ادبی مبصّروں کا ذکر کیا جاتا کہ۔۔۔ "ایک ادبی مبصّر کا کہنا ہے کہ۔۔۔۔ "یا" ابھی ابھی ہمارے ادبی مبصّر نے اطلاع دی ہے کہ۔۔۔

پوچھنے پر ایک صاف گو ادیب نے بتایا کہ "یہ مبصّر جہاں بھی ہوتے ہوں حوالہ دینے کے لئے نہایت کارآمد ہیں۔ ان کے علاوہ۔۔۔ 'معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ۔۔۔' کی گول مول اضافت بھی خاصی مفید ہے اور۔۔۔ 'ادبی حلقوں میں یہ خبر تیزی سے گشت کر رہی ہے کہ۔۔۔' کا تو جواب نہیں۔"

جب بھی افواہوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، فکر صاحب "ابھی آیا" کہہ کر کچھ دیر کے لئے غائب ہو جاتے۔

کبھی فکر صاحب کے بے تکلّف دوست اکٹھے ہوتے تو ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ صحت کے معاملے میں فکر کا حال ہمیشہ ایک سا رہا، یعنی نہ ساون ہرے، نہ بھادوں سُوکھے۔ شاید اس لئے ہے کہ نہ انہیں خوش خوراکی کا شوق ہے اور نہ ورزش کا۔

دوسرا ابتاتا کہ چُست رہنے کے لئے انہیں صبح صبح پیدل سیر کرتے ہوئے تو دیکھا گیا ہے۔ رہ گئی باقاعدہ ورزش، تو یوں لگتا ہے جیسے انہیں کسرت کے فوائد پر

شبہات ہوں۔ پھر کسرت پر کوئی ولایت سے نئی نئی آئی ہوئی پختہ عُمر MATRONکا قصّہ سُناتا جو کسی دیسی تہوار پر ہسپتال کے عملے کی خوشیوں میں گرمجوشی سے شامل ہوئی لیکن جب اکھاڑے میں دیسی لنگوٹ کسے ہوئے پہلوانوں کی کُشتیاں شروع ہوئیں تو پہلے مقابلے پر گھبرائی۔ دوسرے تیسرے پر ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ آخری کُشتی پر تو باقاعدہ غش کھانے کو تیار تھی۔ وجہ پوچھنے پر نہایت معصومیت سے بولی:

"They were trying to pull down whatever little they had on them"

کسی کو شُبہ ہوا کہ فلکر کی کم خوراکی اور کبھی کبھی ٹائی پہننا، خصوصاً ادبی تقریبوں میں کافی پراسرار ہے اس میں ضرور کوئی راز ہو گا۔ سند کے طور پر حاجی لق لق کا یہ شعر پیش کیا جاتا:

میں کہاں اور مغربی فیشن کہاں

میری NECKTIEمیں بھی اِک راز ہے

یہ لق لق کی اس مشہور "پولیٹیکل غزل" کا ایک شعر ہے جو انہوں نے سہراب مودی کی فلم پُکار کے ہر دلعزیز گانے ؏ زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے۔۔ اور

انگریز حکمرانوں کی ناپسندیدہ مار دھاڑ سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔۔"یا کہی تھی۔"
غزل کا یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا:

اُف یہ لاٹھی چارج بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

لیکن دوسرا اُن کی طرفداری میں کہتا کہ کھانا کھاتے وقت انٹلکچوئل باتیں بھی کرنی پڑیں تو کافی دقّت ہوتی ہو گی، کھانے میں بھی اور گفتگو میں بھی۔ تبھی چند سو برس پہلے جاپان میں بادشاہ شوگناتے کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ادبی تقریب میں شامل ہونے والے اپنے گھر سے کھانا کھا کر آیا کرتے تا کہ محض دانشورانہ اور نفیس گفتگو پر توجّہ دے سکیں۔ پھر رخصت ہوتے وقت میزبان اُنہیں لذیذ کھانوں کا پیکٹ پیش کرتا تا کہ اگلے راز اطمینان سے نوش فرمائیں۔

کوئی اس رسم کی تعریف کرتا کہ یہ سلسلہ جاری ہو سکتا تو بہتر ہوتا اور یہ کہ کچھ اتنی دیر بھی نہیں ہوئی کہ اسے دوبارہ شروع نہ کیا جا سکے۔

فکر کی پسند ناپسند پر فقرے کسے جاتے۔ مثلاً یہ کہ جس لفظ کے آخر میں۔۔۔ IST- یا ISM- ہو اس سے انہیں قطعاً دلچسپی نہیں رہتی۔

چنانچہ وہ فاشزم، مسمریزم، ریڈ ٹیپ ازم، ہپناٹزم، مارکسزم سے بھی اتنا ہی کتراتے جتنا کہ سوشلسٹ، موٹر سائیکلسٹ، امپیریلسٹ، سائی کیٹرسٹ، سائنٹسٹ، انارکسٹ وغیرہ سے۔

(۹)

اُن کی تازہ کتاب فکرنامہ ایک طرح کا ذاتی ریکارڈ ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ اس میں سے بہت سے چُٹکلے نقل کئے جائیں۔ لیکن یوں کیا تو کتاب کا کافی حصّہ آؤٹ ہو جائے گا (جیسے کہ امتحان کا پرچہ آؤٹ ہو جاتا ہے) اس لئے محض گِنی گنائی چیزیں یہاں درج کی ہیں۔

فکر صاحب لکھتے ہیں کہ:

- "جملہ حقوق۔۔۔سب کے نام محفوظ"۔

برصغیر میں کاپی رائٹ ایکٹ کی جو درگت ہوئی ہے اس کی اتنی عمدہ تشریح اس سے بہتر انداز میں کرنا مشکل ہے۔

- "انتساب اپنے نام"

انھوں نے کتاب اپنے نام معنون کی ہے۔ اس لئے کہ بغیر اپنے عزم اور اپنی ہمّت کے کتاب تو کیا ایک معمولی سا پمفلٹ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔

- ”یعنی جہنّم ہی سے میرے اور دیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور اب تک کشیدہ ہیں۔“

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بدگمانیاں یکطرفہ نہیں عموماً باہمی ہوا کرتی ہیں، خصوصاً جبکہ دوسری پارٹی طاقتور ہو۔

- ”بہن بھائیوں میں میرا ساتواں نمبر تھا۔ لیکن والد محترم کے لئے پیدائش صرف ہندسوں تک محدود تھی۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں۔۔۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ہندسوں سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ آج تک بگڑے ہوئے ہیں۔“

حالانکہ فکر انگریزی اصطلاح کے مطابق LUCKY SEVEN کے زمرے میں تھے۔

- جب پچانے پوچھا ”تمھیں شرم نہیں آتی؟“

”آتی ہے۔۔۔“ میں مُسکرایا۔

ایسے موقعوں پر یہ بالکل صحیح اور مخلص جواب ہے۔

- ”وہ چند ایک اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے اور چند ایک اوصافِ حمیدہ کے مالک نہیں تھے۔ اس لئے بڑے متوازن انسان تھے۔“

جنہوں نے ریاضی پڑھی ہے وہ اس EQUATION سے دوگنا لطف اُٹھائیں گے۔

- ”ہمارے دھوبی نے مرتے دم تک اپنا جنم دِن نہیں منایا۔ کیونکہ انہیں عمر بھر پتہ ہی نہ چلا کہ وہ جنم لے چکے ہیں۔“

واقعی ان خِطّوں میں بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جنہیں اپنے ہیپی برتھ ڈے کا نہ تو علم ہے اور اگر ہے بھی تو یہ نہیں جانتے کہ اس روز کیا کِیا جاتا ہے۔

- کسی کے پیچھے کتّا لگاتے وقت۔۔ ”میں نے یہ سُن کر اپنے کتّے سے کہا کہ ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ۔“

شائستگی کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

- ”سالہا سال کے تلخ تجربے کے بعد میں مایوس ہو گیا کہ میری بیوی سے کوئی عقلمندی سرزد نہیں ہو سکتی۔“

یہ پڑھ کر امریکی مزاحیہ ایکٹر گراؤچو مارکس یاد آجاتا ہے، جس نے بیوی کی اس شکایت پر کہ تم شادی کے بعد سرد مہری برتتے ہو، یہ جواب دیا تھا کہ تمہیں یاد ہو گا میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شادی شدہ عورتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

- (فکر نامہ میں کنہیالال کپور پر بھی ایک مضمون ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ان سے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتیں۔ پھر وہ موگا چلے گئے اور کئی برس کے بعد اپنے مجموعے ”دلیلِ سحر“ کو راقم الحروف کے نام معنون کیا۔ اس مصرع کے ساتھ

میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تحریروں اور طبیعت کی بشاشت ان کی نمایاں خوبی تھی۔ زندگی کی ناہمواریوں اور ناکامیوں کو وہ ہمیشہ مسکراہٹ کے لٹھ سے ہانکتے۔ حالات کتنے ہی ناگوار ہوتے، ان کے رویّے میں فرق نہ آیا جس پر واٹرلو کی جنگ کا

وہ انگریز ٹامی یاد آجاتا، جس نے بے شمار لڑائیوں کے فاتح نپولین کو شکست کھانے کے بعد اپنی پیرس جانے والی بگھی میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو نعرہ لگایا:

COME ON MARSHAL, YOU CANNOT WIN THEM ALL

(روایت ہے کہ نپولین نے فقرہ سُن کر سمجھ بھی لیا تھا)

- فنڈ کے لئے اپیل پر۔۔ "دوست نے اپیل کرتے وقت گیارہ روپے بھی دیئے۔ دیکھتے دیکھتے دو ہزار اکٹھے ہو گئے جن میں پچانوے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے۔ اِن پچانوے روپوں میں سے تین نوٹ پھٹے ہوئے تھے۔"

ایسے موقعوں پر یہی ہوتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

- گیدڑ کو معلوم ہے کہ شہر میں اس کے کھانے اور رہنے کا کوئی بندوبست نہیں اور گائے اگر شہر کا بائیکاٹ کر کے جنگلوں میں سکونت اختیار کر لے تو وہ بھی اتنی ہی خوفناک ہو سکتی ہے جتنا شیر اور بھیڑیا۔

یعنی ہم نے اپنے مطلب کے لئے جو حیوان پالتو بنا رکھے ہیں ان کی اور جنگل میں مجبوراً رہنے والوں کی پوزیشن کسی وقت VICE VERSA ہو سکتی ہے۔

اور بھی بہت سی پھلجھڑیاں ہیں۔ مثلاً۔۔۔۔

- "ہماری آبائی جائیداد دو کمروں والا مکان ہے جو ہم نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ یا پھر والد محترم کے قبضے میں ایک بَہی کھاتا ہے جس میں درج ہے کہ ہمارے خاندان کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہے جس پر آج کل ایک دریا بہہ رہا ہے۔ والدِ محترم گزشتہ گیارہ برس سے اس دریا کے سوکھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

- "برادر موصوف کا رنگ گندمی ہو گیا کیونکہ گندم کھانا شروع کر دیا۔ جوان ہوتے ہی سیاہی مائل ہو گیا۔ پتہ نہیں جوانی میں چوری چھُپے اس نے کیا کھانا شروع کر دیا۔"

اور جب والد صاحب اسے بُرا بھلا کہتے تو لمحے بھر کے لئے رنگ پیلا پڑ جاتا۔ گویا وہ بڑا رنگارنگ آدمی تھا۔

- میرے کرایہ دار کا نام گجانند تھا جو اگرچہ نامعقول نام تھا لیکن وہ منسٹر کا سفارشی خط لے کر آیا تھا۔

- "مجھے ایک جیوتشی پنڈت رگھو دیال شاستری نے کہا تھا کہ تیری موت کسی اونچی جگہ سے گرنے سے ہو گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہیے

کہ اس جیوتشی کو پکڑ کر کسی اُونچی جگہ سے گرادیں تا کہ اس کا جیوتش اگر میرے حق میں صحیح ثابت نہ ہو تو اس کے حق میں ہی صحیح ثابت ہو جائے۔"

- "تم مجھے رشوت دے کر میرا ضمیر خریدنا چاہتے ہو؟" میں نے گرج کر کہا تھا۔ (اُن دِنوں میں کافی احمق تھا)

- لیکن ڈنڈا بلّی کی بجائے دودھ کی کڑھائی کو جالگا۔ دودھ اُلٹ گیا۔ نہ بلّی کے کام آیا نہ میرے۔ میں اور بلّی دونوں بہت دیر تک کفِ افسوس ملتے رہے۔"

- "مِنّی بس کے اڈے پر وہ رش تھا کہ کئی سواریوں کو تو اس دھکا پیل میں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انہیں اُترتا ہے یا چڑھنا ہے۔"

(۱۰)

پڑھنے والوں کی رائے میں مشرقی معاشرے پر لکھتے ہوئے فکر صاحب کی نگارش دن بدن نکھرتی جارہی ہے لیکن اتفاق سے مشرقی معاشرے اُسی رفتار سے بے تُکا ہوتا جارہا ہے۔ یعنی میزان تقریباً برابر برابر ہے۔

کوئی قنوطی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس موضوع پر جوں جوں ان کی تحریریں بہتر ہوتی جائیں گی۔ شاید معاشرے کے حالات اور بھی ہونّق ہوتے جائیں گے۔ لیکن اس میں فکر کا کوئی قصور نہیں ہو گا۔

کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فکر کا پرانے مدرسۂ فکر سے تعلق ہے کیونکہ وہ اس صدی کے پہلے ربع میں پیدا ہوئے لیکن وہ FIFTIES کی نسل میں بھی شامل رہے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری اور نثر کے عمدہ حصّے صدی کے وسط میں بھی چھپے۔ اور فکر نامہ چونکہ ابھی شائع ہوا ہے اس لئے ان کا عہدِ جدید سے بھی پورا واسطہ ہے۔

مضمون یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک دوست نے ٹوکا کہ یہ کافی طویل ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی بتایا کہ لکھنے والے کو اپنی خامیوں کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہ ایسا مضمون فنِ تعارف نویسی کو برسوں پیچھے لے جا سکتا ہے یا پھر کسی اور سمت میں۔

عکسِ تقدیر

(واضع رہے کہ یہ مفید باتیں محض قیاس پر مبنی نہیں بلکہ ہمارے ماہرین نے اپنے قیمتی تجربے اور تحقیقات سے اخذ کیں ہیں)

حالاتِ سیّار گان

بادشاہِ سال شمس مالک فلک چہارم حاکم اقلیمِ خراساں ہے۔ مہینے کا راجہ قمر یعنی چندرمان مالک فلکِ اوّل قرار دیا گیا ہے اور دسویں استھان میں پڑا ہے۔۔۔ برچھک راس والوں کا ستارہ مریخ ہے جس کا پایہ زُحل ہے اور بُرج اسد جو منقلب برج ہے۔ غالباً تلا راس اور برکھا راس والوں کا بھی یہی ستارہ ہے اور شاید کنیا راس اور متھن راس والوں پر بھی اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔ (البتہ دھن راس اور مکر راس والوں کی اور بات ہے)۔

اس مہینے میں پیدا ہونے والوں کی خصوصیات

جو اس مہینے میں پیدا ہوئے ہیں اُن میں بے شمار خوبیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ حُسن کے شیدائی اور لذیذ غذاؤں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً شیریں اور مُرغّن اشیاء سے ذوقِ کامل ہوتا ہے۔ (لہٰذا خوش خوراکی سے امراضِ شکم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وزن بڑھ جاتا ہے۔ اوّل الذّکر خوبی کی وجہ سے اوائل عمر میں خواہ مخواہ شادی کرا بیٹھتے ہیں)۔

خوش پوشاک ہوتے ہیں۔ (لیکن ایک مرتبہ موٹے ہو جائیں تو جو لباس بھی پہنیں Fancy Dress معلوم ہوتا ہے)۔

فطرتاً شرمیلے ہوتے ہیں، یعنی ذہنی برتری اور قوّتِ بازو کا احساس انہیں ہر وقت رہتا ہے۔ لیکن ان دونوں خوبیوں کا عملی مظاہرہ کرنے سے ہچکچاتے رہتے ہیں۔

حسّاس بھی ہوتے ہیں۔ (کھیل کود یا تعلیم میں جو کوئی ان سے مقابلہ کرے اس سے خفا ہو جاتے ہیں اور اس کی جسارت کو کبھی معاف نہیں کرتے)۔

چونکہ مُشتری سیّارہ وسط ماہ کو ان کے زائچے میں آٹھویں گھر بحالت رجعت براجمان ہے اس لئے قدرے (بلکہ اچھے خاصے) وہمی بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا پیری مریدی کا چسکا بھی ہوتا ہے۔

ان میں قوّتِ برداشت ہوتی ہے (لیکن اس قوّت کو استعمال بہت کم کرتے ہیں۔) کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی بے تکی خوش فہمی اور اُمّید پرستی کا دامن نہیں چھوڑتے۔(اور ہاتھ پاؤں قطعاً نہیں ہلاتے)۔

بلاوجہ دولت مل جانے پر یقین رکھتے ہیں۔(تبھی لاٹری، پیروں کی کرامات، سٹّہ، گھُڑدوڑ اور انعامی معمّوں پر کامل اعتقاد ہوتا ہے) جب کامیابی نہیں ہوتی تو تقدیر کو بُرا بھلا (زیادہ بُرا) کہتے ہیں۔

جہاں فراخ دلی کا اکثر مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے تفکّرات اور پریشانیاں دوسروں پر نچھاور کرتے رہتے ہیں۔ وہاں کفایت شعاری سے بھی کام لیتے ہیں اور شگفتہ اور خوش کرنے والی باتیں بحفاظت اپنے پاس چھپائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح عزیزوں، دوستوں کی تعریف کرتے وقت بھی کفایت برتتے ہیں۔(اور اگر کسی اچھّے کو مجبوراً اچھّا کہنا پڑ جائے تو آخر میں "مگر" یا "لیکن" لگا کر محض دو تین فقروں سے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں)۔

طبیعت میں بلا کی سادگی ہوتی ہے۔ مثلاً گیہوں کو خوب پِسواتے ہیں۔ پھر چھان چھان کر اپنے لئے باریک ترین حصّے کو گندھوا کر روٹیاں پکواتے ہیں اور بقیہ حصّہ جانوروں کو ملتا ہے۔ اسی طرح چاول اُبال کر "پیچ" علیحدہ کروادیتے ہیں۔ چنانچہ VITAMIN-B گھوڑوں، گایوں، بلّیوں وغیرہ کو مِلتا ہے۔ ساتھ ساتھ کھانے

کی ہر چیز کو خوب بھُون کر یا اچھّی طرح تل کر باقی ماندہ وٹامنز کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے اور خود سال بھر بازار سے وٹامنز کی گولیاں اور ٹیکے خریدتے رہتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر وٹامنز کا ٹیکہ تجویز نہ کرے تو بُرا مان جاتے ہیں کہ اس نے ٹرخا دیا ہے)۔

انہیں موسیقی سے خاص رغبت ہوتی ہے اور ریڈیو سیلون سے فلمی گانے باقاعدگی سے سُنتے ہیں۔ دیگر فنونِ لطیفہ کا شغف اُنہیں بار بار فلمیں دیکھنے اور فلمی رسالے پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

ان میں تجسّس کا مادہ بہت پایا جاتا ہے۔ (لہٰذا پڑوسیوں اور دوسروں کے بارے میں تازہ ترین اور قدیم ترین معلومات فراہم کرنے کی لگن رہتی ہے)۔

خوش خوراکی، آرام طبّی، ورزش کی کمی اور خود ساختہ فکروں سے جہاں لڑکپن میں اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگتے ہیں وہاں جوانی میں اُدھیڑ عمر کے ہو جاتے ہیں اور اُدھیڑ عمر میں بوڑھے۔ (اُدھیڑ عمر کی پہلی نشانی یہ ہے کہ سر کے کھچڑی بال بالکل سیاہ ہونے شروع ہو جاتے ہیں)۔

یہ حصولِ علم میں بڑی سرگرمی دکھاتے ہیں۔ (لیکن فقط فائنل امتحانوں تک)۔ تعلیم سے فارغ ہو چکنے یا ملازمت مِل جانے کے بعد علم کے پاس بہت کم پھٹکتے

ہیں۔(اگرچہ کچھ لوگ محض TIME اور ریڈرز ڈائجسٹ جیسے رسالوں کو پڑھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ہر موضوع پر سب کچھ جانتے ہیں)۔

انہیں ماضی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ بھولے بِسرے دِنوں کی یاد میں اکثر کھوئے رہتے ہیں۔(خصوصاً شعرا)۔

طبیعت میں بھولپن ہوتا ہے۔ تبھی ان میں سے کچھ لوگ جہاں دھوم دھڑلّے سے عبادت کرتے ہیں وہاں تھوڑی بہت دل آزاری، کچھ چغل خوری اور قدرے غلط بیانی کا شغل بھی کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ اکاؤنٹنٹ "ڈبل ENTRY سِسٹم" کے تحت آمدنی اور خرچ دونوں صفحوں پر دوبارہ دکھاتا ہے۔ یہ بھی شاید اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوں کہ ثواب کی اور اُلٹی سیدھی حرکتوں کی ڈبل انٹری میں میزان کا جھکاؤ PLUS کی طرف رہے تو خیر ہے)

دُھن کے پکّے ہوتے ہیں۔ یعنی خط ڈالنا ہو تو نگاہیں سیدھی لیٹر بکس پر ہوتی ہیں، سڑک پر دہنے بائیں موٹروں، لاریوں کو بالکل نہیں دیکھتے۔

باہمّت بھی ہوتے ہیں اور ان میں غم اور فکر برداشت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ (یعنی کسی اور پر مسلّط غم اور فکر کو برداشت کرنے کا)۔

ویسے یہ سادہ لوح ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر خواہ مخواہ خوش ہو جاتے ہیں۔ اتنی سی بات پر ناحق غمگین ہو جاتے ہیں۔ (چنانچہ ذرا ذرا سی دیر کے بعد موڈ بدلتا رہتا ہے)۔ سادہ لوحی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ بُری خبر آئے تو اُس ڈاکیے کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اور اچھّی خبر آنے پر اُسے مٹھائی کھلاتے ہیں۔

نہایت ذہین ہوتے ہیں اور طرح کے جدّت آمیز منصوبے باندھتے رہتے ہیں۔ (خصوصاً دوسروں کے لئے تو نہایت ہی عمدہ اور اعلیٰ منصوبے تیار کر سکتے ہیں)۔

دیگر خصوصیات

ان کا قد پانچ فٹ سے چھ فٹ تک ہوتا ہے۔ (یعنی جب سیدھے کھڑے ہوئے ہوں تب) رنگ سفید، گندمی یا مُشکی۔ وزن ایک من سے تین من پختہ تک، جسمانی لحاظ سے یا تو خوب موٹے تازے ہوتے ہیں یا بالکل دُبلے پتلے۔

مُبارک پھول............... گوبھی کا پھول

مبارک دن............... چھُٹّی کا دن

مبارک ہفتہ............... چھُٹّی کا ہفتہ

مبارک وقت............... ناشتے، لنچ اور ڈِنر کا وقت

مبارک نگ.......... یاقوت۔ زمرّد نیلم، فیروزہ اور دوسرے قیمتی سنگریزے۔(اگرچہ خریدنے کی توفیق ہوتب ورنہ نہیں)

شادی خانہ آبادی................ جن کا نام یے سے شروع ہوتا ہے ان کی شادی اُن لڑکیوں سے مبارک ثابت ہو گی جن کا نام الف سے شروع ہوتا ہے۔ اگر بزرگ رضامند ہوئے تب)۔ ب والیوں کی شادی چھوٹی یے والوں سے سعید رہے گی۔ (اگر بزرگ رضامند ہوئے تب)۔ بقیہ ناموں والے اسی فارمو لے۔(بزرگوں کی رضامندی) کے مطابق حساب لگالیں۔

ویسے شادیاں سب کی ہو جائیں، یہاں تک کہ بہت سوں کی تو دو دو تین تین مرتبہ ہوں گی۔ دانشوروں اور Pseudo-Intellectual خواتین و حضرات کو بھی اس سلسلے میں خوشخبریاں ملیں گی۔

یہ مہینہ کیسا ہے؟

اس مہینے میں شمس، مُشتری اور مریخ اور دیگر سیّار گان خیریت سے ہیں سوائے چندرمان کے جس پر راکٹ، آدمی اور جانور وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔ لہٰذا اشا تقین کی عجیب وغریب پیشین گوئی یا سنسنی خیز انکشاف سے قطعاً محروم رہیں گے۔

اس مہینے میں سورج علی الصبح طلوع ہو کر مغرب کے وقت غروب ہو گا۔ پہاڑی علاقوں میں خُنکی اور صحرائی خِطّوں میں تمازت رہے گی۔ حسبِ معمول کہیں کہیں بارش کے چھینٹے پڑیں گے۔

عاشق ہونے، آپریشن کرانے، شادی کرنے اور دیگر جرأت اور بہادری کے اقدامات کے لئے یہ بہترین مہینہ ہے۔ فلم سازی کے لئے بھی موزوں ہے۔ (فلم خواہ کتنی ہی اوٹ پٹانگ کیوں نہ ہو، لیکن سہ پہر اور شام کو نہ تو لوگ ورزش کرتے ہیں نہ GAMES میں حصّہ لیتے ہیں۔ اس لئے لاتعداد تماش بین سینما دیکھنے پہنچ جائیں گے)۔

فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو بھی یہ ماہ راس آئے گا۔ ان کی صحت اور بھی بہتر ہو جائے گی اور وزن میں تین چار سیر کا مزید اضافہ ہو گا۔ البتہ تماش بینوں کو بند سینما ہال میں بار بار ڈھائی گھنٹے بیٹھے رہنے سے امراض بھی لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

گمشدہ بخیریت واپس پہنچ جائیں گے۔ (روپے ختم ہو جانے پر)۔ صنفِ نازک سے (حسبِ معمول) دلچسپی برقرار رہے گی۔ لوگ تعمیری کاموں میں جوش و خروش سے حصّہ لیں گے۔ (اور نئے نئے ڈیزائن کے مکان تعمیر کر کے نہایت اچھے کرائے حاصل کریں گے)۔

کچھ لوگ اپنے قیمتی راز دوسروں کو بتا کر یہ توقع رکھیں گے کہ وہ راز محفوظ رہیں گے۔ (یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کچھ وہ خود نہیں سنبھال سکے اسے دوسرے کیوں کہ سنبھالیں گے اور یہ کہ دوستوں کے اور بھی دوست ہوتے ہیں)۔

کئی اچھّے لوگوں سے تعلقات پیدا ہوں گے۔ (اگر ان سے خلوص سے ملے اور کوئی مطلب نہ ہو اتب)۔

مال مویشی کی تجارت نفع بخش ثابت ہو گی۔ (خصوصاً گائے، بھینسوں کی۔۔ پانی میں جن کا ملا ہوا رقیق دُودھ سب کو مرغوب ہے)۔

کسی قسم کے تنازعے سے (جو بالکل بے معنی ہو گا) طبیعت چند دنوں گری گری سی رہے گی۔

اولاد کی طرف سے (چند گھنٹوں کے لئے) سُکھ اور چین نصیب ہونے کا امکان ہے۔ کوئی دلی مقصد پورا ہو گا۔ (اگر اس کے حصول کے لئے محنت کی تب)۔

کبھی کبھی خوش کُن خواب نظر آئیں گے۔ (اگر شام کو اچھی طرح ورزش کی تو)۔ کوئی نیا کام خود کرنا نفع بخش ثابت ہو گا۔ لیکن وہی کام دوسروں کی شرکت سے کیا تو پتہ نہیں، نفع ہو گا یا نقصان۔

چند (خود ساختہ) اُلجھنوں کی وجہ سے اِدھر اُدھر (زیادہ اُدھر) جانا پڑے گا۔ جہاں BUS کے سفر سے اختلاجِ قلب اور اعصابی شکایات ہوں گی وہاں ٹرین کی DINNING CAR اور اسٹیشن کے آس پاس کے ہوٹلوں سے کھانے کے بعد پیچیدہ امراض کا اندیشہ رہے گا۔

دیگر مہینوں کی طرح اس ماہ میں بھی کچھ لوگ سچ بولنے کی جدوجہد میں تھوڑی بہت حاشیہ آرائی ضرور کریں گے۔ (یہ جانتے ہوئے بھی کہ مکمل طور پر سچ بولنے کا سب بڑا افائدہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا ہو وہ یاد نہیں رکھنا پڑتا)۔

کچھ لوگ خواہ مخواہ جوش میں آ کر بیاہ شادیوں پر بے تحاشا خرچ کر بیٹھیں گے۔ اور بعد میں جب زحل کے قریب عطارد اور مریخ کا اجتماع ہو گا تو دل کھول کر پچھتائیں گے۔(وہ لوگ)۔

کچھ پروفیسر پی ایچ ڈی اور نقّاد آپس میں اور بھی بدگمان ہو جائیں گے۔ جس سے نوّے نوّے صفحے کے لاتعداد مقالے چھپیں گے۔(جنہیں کوئی بھی نہیں پڑھے گا)

اہلِ قلم کے حالات حسبِ معمول خستہ رہیں گے۔ لیکن وکیل، ٹھیکیدار اور پبلشر ہمیشہ کی طرح نفع میں رہیں گے۔

زُحل اور تنقید نگاروں کا باہمی فاصلہ بڑھا تو سب کو فائدہ پہنچے گا (غالباً نقّادوں سے زیادہ زُحل مستفیض ہو گا)۔

چند آسودہ حال پبلشرز (پچھلے مہینوں کی طرح) کاپی رائٹ ایکٹ کو نظر انداز کریں گے اور ایکٹ میں دی ہوئی دس سال کی میعاد تو ایک طرف رہی، بیس پچیس برس کے بعد بھی مصنّف کی کتابیں چھاپتے رہنے کے بعد جُملہ حقوق اُسے واپس کرنے سے بدستور گریز کریں گے۔ (شاید وہ یہ سب کچھ اس لئے کریں کہ اپنے عزیز مصنّف کو روپے پیسے کے لالچ سے محفوظ رکھ سکیں تاکہ مصنّف یک جہتی سے ادب کی خدمت کر سکے)۔

کوئی مہربان نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا لیکن پھر یکایک آپ کو چھوڑ کر کسی عطارد سیارے والے کے پیچھے لگ جائے گا۔

اگر اپنے آپ کو صبر وضبط کی حدود کے اندر پابند نہ رکھا تو بیوی کے عزیزوں سے کشیدگی کے امکانات روشن ہیں۔

مچھّروں کو دُور نہ رکھا تو کسی شدید پریشانی کا سامنا ہو گا۔ (آپ کو)۔

بعض اوقات (غالباً ورزش کی کمی سے) اپنے کام سے جی اُچاٹ ہونے لگے گا۔ پھر عزیزوں، دوستوں سے اور آخر میں اپنے آپ سے بھی اُچاٹ ہو گا۔ (لیکن اس میں سیّار گان کا کوئی قصور نہیں ہو گا)۔

کوئی شخص دم دلاسہ دے کر (پچھلے مہینے کی طرح روپے اینٹھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس مہینے یہ عجیب بات ہو گی کہ مٹی میں ہاتھ ڈالا تو مٹی ہی رہے گی اور سونے میں ہاتھ ڈالا تو سونا ہی رہے گا۔

کبھی کبھی دشمنوں کا خوف لگا رہے گا۔ اُدھر دشمن آپ سے خطرہ محسوس کریں گے۔ چنانچہ اس طرح فریقین کا کافی وقت ضائع ہو گا۔

اندرونِ خانہ کچھ پریشانی رہے گی۔ (اگر بیرونِ خانہ کچھ پریشانی رہی تب)۔

طفلانِ خورد سال و مستورات کو (حسبِ معمول) پر اسرار دردوں کی شکایت رہے گی۔ خاوندوں کے مقابلے میں بیویاں نسبتاً لمبی عمریں پائیں گی۔ (شاید اس لئے کہ عورتوں کی بیویاں نہیں ہوتیں)۔

حیوانوں پر (خصوصاً تانگے کے گھوڑوں پر ظلم و ستم ڈھائے جائیں گے۔

بنتے ہوئے کام کے لئے فالتو مدد چاہی تو رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ سفارشوں کا نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلے گا۔ (متعلقہ "بڑے آدمی" حسبِ معمول ٹالنے کی کوشش کریں گے)۔

قرض دار کا قرض ادا نہیں ہو گا اور نہ ہی قرض خواہ مقروض سے کچھ وصول کر سکے گا۔ (آپس میں ناخوشگوار باتیں البتہ ضرور ہوں گی)۔

بچّے کافی تعداد میں پیدا ہوں گے جن میں تقریباً نصف لڑکے ہوں گے اور نصف لڑکیاں۔ (لیکن پبلک کو یہی شُبہ رہے گا کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں)۔

دفتر میں کام کرنے والوں کو (سگریٹ نوشی، چاء کے لگاتار استعمال اور غذا میں گرم مصالحے اور تیز مرچوں سے) تبخیر کی شکایت رہے گی۔ اور جن کو یہ معلوم ہے کہ خون کا دباؤ کیا ہوتا ہے۔ ان کے خون کا دباؤ بڑھ سکتا ہے۔

گھریلو حالات میں پریشانیوں کے سبب طبع نازک میں چند دنوں غیظ و غضب رہے گا۔ (جس سے کوئی متاثر نہ ہو گا بلکہ اُلٹا سب ہنسیں گے)۔

جن لوگوں نے گزشتہ ماہ والی حرکات کیں ان کے حالات گزشتہ ماہ والے رہیں گے۔

چند ہدایات

- کبھی کبھی مُسکرانے کی کوشش ضرور کریں۔ مُوڈ خواہ کیسا ہی ہو مُسکراہٹ سے چہرہ بہتر معلوم ہو گا۔ (نو مشقوں کے لئے ترکیب استعمال۔۔ اپنے ہونٹوں کے کونوں کو اُفقی سمت میں باہر کی طرف کھینچئے)۔

- دوسروں کو صحیح رائے دیتے وقت محتاط رہنا چاہیے۔ چونکہ ایسی رائے ان کی مرضی کے خلاف ہو گی اس لئے وہ فوراً خفا ہو جائیں گے۔

- دُور کے رشتہ داروں سے دُور رہنا خوشگوار ہو سکتا ہے۔ جس قدر دُور رہ سکیں بہتر ہو گا۔

- مارِ آستین قسم کے لوگوں سے بچ کر رہیں بلکہ احتیاطاً دِن میں تین چار مرتبہ آستینیں جھاڑ لیا کریں۔

- سکوٹر سوار سکوٹر سے محتاط رہیں اور پبلک سکوٹر سواروں سے خبر دار رہے۔

- کم از کم تاش کے ذریعے جُوانہ کھیلیں۔ آپ ہار گئے تو چِڑ کر دوسرے کھیلنے والوں سے لڑیں گے۔ جیت گئے تو وہ چِڑ جائیں گے اور آپ سے لڑیں گے۔

- بس میں سفر کرتے وقت ایک ایک منٹ چوکنّے رہیں اور کھڑکی سے باہر کودنے کے لئے بالکل تیار رہیں۔ (اگرچہ بسوں پر حدرفتار چالیس یا پینتالیس میل جلّی حروف میں لکھی ہوتی ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ طفل تسلیاں ہیں)۔

- دار چینی میں شہد ملا کر چٹانے سے ہچکی بند ہو سکتی ہے۔

کاروباری زائچہ

ماہرین کا کہنا ہے کہ بُرج اسد میں جب شمس و مریخ کا اجتماع ہوتا ہے تو سوداگروں کی طبیعت خوش رہتی ہے اور مارکیٹ کا بھاؤ دونوں طرف چلتا ہے۔ گُڑ، تارا میرا، گھاس اور باجرہ ارزاں ہوتے ہیں اور زعفران، مُشک، نافہ، ایلومینیم جواہرات اور ہاتھی دانت کے بھاؤ اُونچے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال بزنس والوں کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔

اس مہینے کی گرہ چال کے مطابق گیہوں، مونگ، مسور، جَو اور سفید اشیاء۔۔۔ گھی، دُودھ، چینی، روئی، دہی اور سُوت وغیرہ کے بھاؤ کچھ لوگوں کو سستے معلوم ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ پِسی ہوئی مرچیں سالم مرچوں کے مقابلے میں ارزاں بِکیں۔

گھاس کی افراط سے چوپائیوں کی صحت قابلِ رشک رہے گی۔ (لیکن پانی میں دُودھ کی آمیزش سے خبردار رہنا ضروری ہے)۔

گندم نما جَو فروشوں سے دُور رہیں۔ (بلکہ جَو نما گندم فروشوں سے بھی میل جول نہ رکھیں)۔

شادی کرنے والوں کو سونے چاندی کے نرخ کبھی مہنگے معلوم ہوں گے، کبھی سستے۔ مہینے کے شروع میں اگرچہ سیّارگان کاروباری لحاظ سے کچھ زیادہ سعید نہیں ہوں گے۔ پھر بھی ملازمت پیشہ لوگوں کو بازار کی ہر چیز سستی معلوم ہو گی۔ دوسرے ہفتے میں سیّارگان سعید ہو کر بھاؤ کم کرا دیں گے۔ لیکن تب تک یہ لوگ بازار جانا چھوڑ چکے ہوں گے، حتیٰ کہ مہینے کے آخری ہفتے میں تو معمولی اشیاء (مثلاً گُڑ، چارہ اور تارا میرا) خریدنے سے بھی معذور ہوں گے۔

نوٹ:۔

1) خوش قسمتی سے ہمارے ماہرین نے فقط مہینے ہی کا ذکر کیا ہے۔ متعلقین کے سنہ پیدائش پر زور نہیں ڈالا۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی اور ہدایتیں ایک دو برس کے بچّوں کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہوتی چاہئیں جتنی کہ ستّر اسّی برس والوں کے لئے۔ خواتین و حضرات دونوں پر ان کا اطلاق یکساں ہو سکتا ہے۔

2) ماہرین نے جغرافیائی تقسیم کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ غالباً اس لئے کہ آسمان کے تارے دنیا کے سارے ملکوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ پیشین گوئی اور ہدایات جہاں جاپانیوں پر عائد ہونی چاہئیں وہاں بدّو اور اسکیمو بھی اس کی زد میں ہیں۔ افریقہ کے باشندے اور یورپ کے لوگ بھی۔

3) کائنات میں لا تعداد سیّارگان ہیں، لیکن اتفاق سے ہم مجبور و فانی انسانوں پر فقط ان چند سیّاروں کا اثر پڑ سکتا ہے جن کے ہم نے نام رکھے ہوئے ہیں۔ قمر، مریخ، زہرہ، عطارد، مُشتری اور زُحل۔ (یوں تو کرۂ ارض بھی سیّارہ ہے اور ہم نے اس کا نام بھی رکھا ہوا ہے، لیکن چونکہ ہم اس پر آباد ہیں اس لئے اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے نہ تقدیر پر اس کا کوئی اثر قبول کرتے ہیں)۔

ان کے علاوہ PLUTO، NEPTUN اور URANUS بھی ہمارے محبوب سیّاروں کی برادری میں کچھ عرصے سے شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے ابھی تک ان کا اُردُو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ ہماری زندگیوں پر اثر انداز تو ہونے لگے ہیں لیکن پورے زور و شور سے نہیں۔ یہ تینوں سیّارے مترجم کی راہ تک رہے ہیں اور اُردُو نام پاتے ہی فوراًانہماک سے کام شروع کر دیں گے۔

4) ستارے فقط رات کو چمکتے ہیں اور ان کا اثر ہم پر دن کے وقت پڑتا ہے۔

کام چور بھُوت

میرا دوست اور میں تقریباً رات کے نو بجے گاؤں کے قریب پہنچے۔ میرے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی، دوسرے میں لالٹین۔ میرے دوست نے بھی لاٹھی تھام رکھی تھی۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں مونگ پھلیوں اور اخروٹوں والے گُڑ کی پوٹلی تھی۔

ہمارے ذمّے دو کام تھے۔ پڑوس کے گاؤں کے نمبر دار صاحب کو گُڑ کا تحفہ پیش کر کے انہیں بتائیں کہ ان کا بھیجا ہوا مالی بیمار ہے۔ اگر وہ دوسرا مالی بھیجیں تو اُسے ساتھ لے آئیں۔

ہم اپنے گاؤں سے دوپہر کو چلے تھے لیکن راستے میں میلہ لگا ہوا تھا۔ شام تک وہاں رہے۔ سورج غروب ہونے پر اچانک یاد آیا کہ ابھی چار پانچ میل کا سفر باقی ہے۔ چنانچہ ایک واقف دُکاندار سے لالٹین کرائے پر لے کر روانہ ہوئے۔

گاؤں سے سوڈیڑھ سو گز اِدھر ہی ہمیں کتّوں کے لشکر نے گھیر لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ لالٹین مدد دے گی اور اس کی روشنی میں کتّوں کی اچھی طرح خبر لے سکیں

گے لیکن روشنی میں کتّے خوب نشانہ باندھ کر حملہ کر رہے تھے۔ یکایک میرے دوست کا لٹھ لالٹین پر پڑا۔ اندھیرا ہوتے ہی افراتفری مچ گئی۔ اتفاق سے میں نے ایک کتّے کی دُم پر پاؤں رکھ دیا۔ اس نے نعرہ لگایا۔ دوسرے کتّوں نے اس کا ساتھ دیا۔

ہم دونوں ایسے سرپٹ بھاگے کہ مِنٹوں میں گاؤں پہنچ گئے۔

دیکھا کہ چوپال میں لوگ بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں۔

"وہ دیکھو شکاری صاحب کوئی کہانی سنا رہے ہیں۔" میرا دوست بولا۔

شکاری صاحب بڑے دلچسپ انسان تھے۔ ان کے قصّے ایسے ہوتے کہ اُن پر کچھ یقین آتا کچھ نہ آتا۔ بڑے بوڑھے تو مسکراتے رہتے لیکن لڑکیوں کو، جو اُن سے نوک جھونک بھی کرتے، اُن کی باتیں پسند تھیں۔ خصوصاً جس طرح وہ اپنی کہانی کے اختتام کو یکدم موڑتے۔

معلوم ہوا کہ وہ کسی بھُوت کا قصّہ شروع کرنے والے ہیں۔ حاضرین میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی جو انہیں لگاتار ٹوک رہے تھے۔ اس لئے موضوع بھی بار بار بدل جاتا۔ ہم نے اُن سے طرح طرح کے قصّے سُنے تھے لیکن بھوتوں کا ذکر آج پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ ہمیں پیدل چل کر واپس اپنے گاؤں بھی پہنچنا ہے اس لئے فوراً نمبر دار صاحب کو گُڑ دے کر اور مالی کے متعلق پوچھ کر سیدھے واپس چلیں۔ لیکن وہ بولا۔ "کچھ بھی ہو، آج تو شکاری صاحب کے بھُوت کی کہانی ضرور سنیں گے۔"

ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

وہ ایک شخص کا قصّہ سُنا رہے تھے جو ہر روز مسجد میں صبح کی نماز پر غیر حاضر ہوتا لیکن بقیہ چاروں نمازوں کے وقت باقاعدگی سے پہنچتا۔ لوگ وجہ پوچھے تو وہ ٹال مٹول کر جاتا۔ آخر جب گاؤں والوں نے بہت مجبور کیا تو اس نے بتایا کہ جب وہ نماز کے لئے صبح سویرے گھر سے نکلتا ہے تو ایک بھیانک سی کالی شبیہ اُس کا راستہ روک لیتی ہے۔ اس طرح کہ ڈر کر اسے واپس آنا پڑتا ہے۔ یہ سُن کر لوگ مذاق اُڑانے لگے کہ کیا ڈرپوک انسان ہے۔ پھر کسی بزرگ نے مشورہ دیا کہ اگر اس پراسرار چیز پر قابو پانا چاہتے ہو تو علی الصبح اپنے دونوں ہاتھوں پر سیاہی مَل کر نکلو۔ جونہی وہ سایہ سامنے آئے ہمّت کر کے سیاہی اُس کے مُنہ پر مَل دو۔ اس پر تو وہ اور بھی ڈرا لیکن بزرگ نے ہمّت بندھائی اور چاروناچار وہ تیار ہو گیا۔

اگلی صبح نمازی کیا دیکھتے ہیں کہ وہ شخص ہنستا ہوا چلا آ رہا ہے۔ مسجد میں پہنچتے ہی بڑے فخر سے بولا۔ "بھائیو! آج میں نے اس شبیہ کے مُنہ پر سیاہی مل دی۔"

لیکن لوگوں نے دیکھا کہ ساری کالک خود اس کے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔ دراصل وہ اپنے وہم سے خوف زدہ تھا۔ نہ کوئی سایہ تھا نہ شبیہ تھی۔ یہ نِرا واہمہ تھا جس سے وہ ڈرا کرتا۔

اُنہوں نے حُقّے کے کئی کش لگائے اور اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔

میں نے اپنے دوست کو پھر یاد دلایا کہ اگر ہم فوراً نمبردار صاحب سے مِل کر واپس روانہ نہ ہوئے تو گھر والے بہت خفا ہوں گے مگر وہ نہ مانا۔

"آپ کچھ اپنے متعلق بتایئے۔" ایک نوجوان نے کہا۔

"میں نہایت ہی کم عمر میں پیدا ہوا۔ ابھی چھوٹا سا تھا کہ یتیم ہونا پڑا۔ اور اتنی تگ ودَو، قسم قسم کے تجربوں، محنت مشقت کے باوجود اب تک یتیم ہوں۔"

"آپ کا ذریعۂ معاش کیا رہا ہے؟"

"کیا کہا؟ ذریعہ بدمعاش؟" انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"جی نہیں، ذریعۂ معاش۔۔۔ یعنی روزی کے سلسلے میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں؟"

"پہلے ریاستی پولیس میں ملازم رہا۔ پھر بطور شکاری کئی ریاستوں راجواڑوں میں نوکری کی۔۔۔ اب شکار کے علاوہ کھیتی باڑی کا شغل ہے۔"

"اتنی نوکریوں کے بعد تو آپ کو مزّے سے آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"اتفاق سے میں شروع ہی سے فضول خرچ رہا ہوں۔ تنخواہ کا بیشتر حصّہ پراویڈنٹ فنڈ کی نذر ہو جاتا۔"

"اور باقی کا۔۔۔؟"

"اُسے بینک کے سیونگ اکاؤنٹ میں پھُونک دیا کرتا۔"

"بھلا آپ بیچارے جانوروں کے پیچھے کیوں مارے مارے پھرتے ہیں؟ کیا شکار کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"گزارہ تو بہت سی چیزوں کے بغیر ہو سکتا ہے، مثلاً جو عینک آپ نے لگا رکھی ہے، اس کی ایجاد سے پہلے بھی لوگ کسی نہ کسی طرح دیکھ لیا کرتے ہوں گے، تبھی انہوں نے اس کے بغیر جنگیں لڑ کر ملک فتح کئے۔ نئے برّاعظم دریافت کئے اور آپ نے جو ابھی تمباکو والا پان کھایا ہے اس کی دریافت سے قبل بھی یہ نشہ پورا ہو ہی جاتا ہو گا۔ رہ گیا شکار، سو اگر عمدہ بندوق پاس ہو، اس کا لائسنس اور کارتوس موجود ہوں، تو شکار کھیلنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ انسان کو چُست رکھتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ورزش عمر کو بھی بڑھاتی ہے۔ میں جوانی میں اس قدر صحت مند تھا کہ اکثر ڈاکٹر مجھ سے چِڑا کرتے۔ اب تک

کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں کہ خواب میں بھی سو رہا ہوں، یعنی ڈبل نیند آتی ہے۔ سورج سے مجھے یہی شکایت رہی کہ وہ صبح کو بہت جلد نکل آتا ہے۔۔۔۔“

”لیکن میں نے آج تک نہ ورزش کی، نہ بھاگ دوڑ اور بالکل چُست ہوں۔ عمر بھی ساٹھ سے اُوپر ہے۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”اگر آپ خوب ورزش کرتے تو آج ستّر برس سے اُوپر ہوتے۔“

”آپ نے اتنے برس جنگلی درندوں کا شکار کھیلا ہے۔ آپ بڑے دلیر ہوں گئے۔“

”میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر انسان کسی طرح اپنا ڈر چھپا سکے تو وہ دلیری کہی جا سکتی ہے۔ ویسے اس شغل کے سلسلے میں کئی دلچسپ لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔“

”مثلاً۔۔۔؟“

”جنگلوں میں ایک سائیں جی ملا کرتے جن سے بہت متاثر ہوا کیونکہ انہیں پرندوں جانوروں کی بولیاں سمجھنے کا فن آتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ کچھوا کئی سو برس زندہ رہتا ہے۔ سائیں جی نے دو کچھوؤں کو جو میاں بیوی معلوم ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتے دیکھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ 'سُن لیا بابا، سُن لیا، تم نے

میری زندگی کے بہترین ڈھائی تین سو سال تو ضائع کر دیئے ہیں، اب اور کیا چاہیے۔؟' پھر ایک دن سرحد پر ڈاکوؤں اور پولیس کی آپس میں شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ صحرائی ہرن پہلے تو ڈر کر چھپتے رہے۔ پھر ایک سینیئر ہرن نے ہمّت کر کے حالات کا معائنہ کیا اور ڈار کو کو بتایا کہ 'خواتین و حضرات آپ اطمینان سے گھاس کھایئے۔ آج یہ ہمیں مارنے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کو شُوٹ کر رہے ہیں۔' سائیں جی نے ان شہریوں کے قصّے بھی سُنائے جو پہلی مرتبہ گاؤں آتے ہیں۔ ایک بیل کھیت میں جگالی کر رہا تھا۔ شہر سے کچھ لوگ پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک نے نعرہ لگایا۔ 'پتہ نہیں اس جانور کے مُنہ میں چیونگم کس نے ڈال دیا۔' اسی طرح روہی میں دو اُونٹوں کا مکالمہ سُنا۔ ایک اُونٹ اپنے دوست اُونٹ سے کہہ رہا تھا کہ شدید سردی کے موسم میں میرے مالک کے مربعوں پر شہری مہمان آئے۔ علی الصبح ایک اناڑی نے مجھ پر سواری کی کوشش کی مگر میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ جب اُسے کامیابی نہ ہوئی تو میرے کان، ماتھا، گردن، کوہان، ٹٹول کر آخر ہار مان گیا اور اُترتے ہوئے بولا۔۔ ''آج تو اتنی سردی ہے کہ اُونٹ تک سٹارٹ نہیں ہو رہا، یہاں تک کہ اُونٹ کا سٹارٹر بھی نہیں مل رہا۔''

''معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سائیں جی پر اتنا اعتقاد تھا کہ ان کی ہر بات کا یقین کر لیتے تھے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

"شاید آپ نہیں جانتے کہ مشرق کا سائیں، اطالوی اور ہسپانوی سینور SENOR اور انگریزوں کے سر SIR کے برابر ہے۔ یہ تینوں ہم رُتبہ ہیں۔ ہاں تو میں جانوروں کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک روز سائیں جی نے غلطی سے اپنے ڈلمیشن DALMATION کو ڈانٹ دیا۔ اس نسل کا کتّا آپ نے تو دیکھا ہی ہو گا۔ وہی جو بڑا سارا گُلدار چتکبرا کتّا ہوتا ہے۔ سائیں جی کی ڈانٹ پر جو جواب ملا اُسے انہوں نے فوراً سمجھ لیا۔ کتّے نے بُردباری سے بھونکتے ہوئے شکایت کی تھی۔ 'آپ کو کتّے کی صحیح ترکیب استعمال معلوم نہیں کہ دن میں آرام اور رات کو پہرہ۔ آپ نے مجھے فقط گیٹ کی چوکیداری دے رکھی ہے، لیکن اس پر کوّا تک آ بیٹھے تو خوفناک آواز میں دیر تک بلاوجہ بھونکتا رہوں۔ یہاں تک کہ آپ کے پرانے دوستوں اور عزیزوں کی آمد پر بھی غُل مچاؤں۔ یعنی میں گیٹ کی غلط گھنٹی ہوں۔ چنانچہ دن بھر مجھے خواہ مخواہ اس قدر ہلکان کر دیا جاتا ہے کہ رات کو نیند آ جاتی ہے اور جب بھی آپ دو ہفتوں کے بعد اس خاکسار پر ملتفت ہوتے ہیں تو انگریزی میں۔ 'کم بیک۔'' نو'۔ 'ڈونٹ ڈواِٹ'۔ حالانکہ کتّوں کو انگریزی کیا اُردُو تک نہیں آتی۔ دوسری شکایت مجھے یہ ہے کہ آپ کے کچھ ملاقاتی مجھے ایسا سفید کُتّا سمجھتے ہیں جس پر سیاہ دھبّے پڑے ہوئے ہوں۔ باقیوں کا خیال ہے کہ میں دراصل کالا کتّا ہوں جس پر غلطی سے سفید چھینٹے ڈال دیئے گئے تھے۔ یہ

کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں اعلیٰ نسل کا ڈلمیشن ہوں جو حادثاتِ زمانہ سے جاہلوں میں آپھنسا ہوں۔'"

"آپ تو کسی بھُوت کا قصّہ سنانے لگے تھے۔" وہی جانی پہچانی آواز آئی۔

"ابھی سُناتا ہوں۔ ہاں تو سائیں جی نے ایک بلّی کا واقعہ بھی سُنایا، جو بلّی کی سہیلی نے دیگر بلّیوں کو بتایا تھا۔ سردی کے موسم میں اس پالتو بلّی کا پنجہ پھِسلا اور کیچڑ میں گر گئی۔ مالک نے جو پہلوان بھی تھا، نہ ٹھنڈ کا خیال کیا نہ کسی اور چیز کا، فوراً صابن اور ٹھنڈے پانی سے اُسے دھونا شروع کر دیا۔ سائیں بھی قریب سے گزر رہے تھے۔ اُنہوں نے منع کیا تو جواب ملا کہ آج اتوار ہے۔ اگر چھٹی کے دِن بلّی نہ دھوئی جا سکی تو ہفتے بھر اسی طرح رہے گی اور کہیں وردی وغیرہ کو خراب نہ کر دے۔"

اتفاق سے سائیں جی شام کو پھر وہاں سے گزرے تو دیکھا کہ بلّی کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہوں نے پہلوان کو صُبح کی گفتگو یاد دلائی۔ اس پر وہ بلّی ناشناس پہلوان بولا۔ "جناب یہ بلّی دھونے سے نہیں مری بلکہ نچوڑنے سے مری ہے۔"

"آپ اُن سائیں جی سے اب بھی ملتے ہیں؟" ایک نوجوان نے بات کاٹی۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"ہوا یہ کہ ایک روز اُنہوں نے تاش کے کھیل شروع کر دیئے۔ پانچ روپے کی شرط لگا کر تاش کی گڈّی میرے سامنے کر کے کہنے لگے کہ کوئی سا پتّہ نکال لو۔ تمہارے دیکھنے سے پہلے بتا دوں گا کہ کیا ہے۔ میں نے ایک پتّہ نکالا ہی تھا کہ وہ بولے۔ "چڑیا کی پنجی۔۔۔ اور لاؤ پانچ روپے۔" میں حیران ہوا تو بولے کہ "اگر یقین نہ آیا ہو تو پانچ روپے کی شرط پر بے شک دوسرے پیکٹ سے پتّہ نکال لو۔" اُنہوں نے دوسری گڈّی اُٹھائی۔ ابھی پتّہ کھینچا ہی تھا کہ بولے۔ "حکم کا یکّہ۔" یہ حکم کا یکّہ ہی تھا۔ میری حیرت پر تیسری گڈّی استعمال کی گئی اور پان کا نہلا بھی انہوں نے فوراً بھانپ لیا۔

دفعتاً انہیں ایک زبردست چھینک آئی۔ ایسی کہ تینوں گڈیوں کے پتّے اُڑ کر بکھر گئے۔ جب میں نے بے شمار پتّے ایک جیسے دیکھے تو حیران ہو کر انہیں پھیلایا۔ ایک سالم پیکٹ حکم کے یکّوں کا تھا۔ دوسری گڈّی میں فقط پان کے نہلے تھے اور تیسری میں باون کے باون پتّے چڑیا کی پنجیوں کے۔۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ آہستہ آہستہ سائیں جی سے عقیدت میں فرق آ گیا۔ آپ یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ اس سے اُن ہارے ہوئے پندرہ روپوں کا کوئی تعلق ہے۔"

"ریاستوں کی ملازمت کیسی رہی؟"

"بُری نہیں تھی۔ اکثر راجواڑوں میں شکاری کو محض رسمی طور پر رکھنے کا رواج رہا ہے۔ یعنی اسے غیر شکارانہ کام بھی دیئے جاسکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ نواب اور راجہ پتہ نہیں کِس بات پر یونہی ناراض ہو جاتے اور کس بات پر خوش۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان سمجھا سکتا ہے لیکن خود نہیں سمجھ سکتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔۔۔۔ نہیں ایک دفعہ کا نہیں، کیونکہ مجھے وہ مہینہ اور سال اب تک یاد ہے۔ جنگل میں شیر دُور کھڑا دھاڑ رہا تھا۔ میں نے بندوق کو مضبوطی سے تھام کر نشانہ لیا اور لبلبی دبادی۔ لیکن اتّفاق ملاحظہ ہو کہ شیر بندوق کی زد سے فقط چار فٹ دور تھا۔ گولی زنّاٹے سے گئی مگر شیر کی دُم سے چار فٹ اِدھر ٹھنڈی ہو گئی۔ خود شیر نے پیچھے مُڑ کر گولی کو زمین پر گِرتے دیکھا اور میں نے نوٹ کیا کہ اس کے چہرے پر غصّہ بھی تھا اور مسکراہٹ بھی۔ ساتھ ہی ایک اور تماشا ہوا۔ ایک ایسے شیطان چیتے سے آمنا سامنا ہو گیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی چھلانگ بیس اکیس فٹ ہے۔ اور میرے نشانے کا یہ عالم تھا کہ میں اکیس فٹ تک چونّی اٹھنّی کے دو ٹکڑے کر دیا کرتا۔ دفعتاً درختوں میں سے اُس کی انگارے جیسی آنکھیں چمکیں اور وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے جھاڑیوں کی آڑ لی۔ جونہی میں اور وہ مطلوبہ فاصلے یعنی بیس اکیس فٹ پر آئے تو فوراً اُس نے مجھ پر کُودنے کی تیّاری کی اور میں نے شست لی۔ پتہ نہیں پہلے بندوق چلی یا وہ کُودا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نہ اسے کچھ ہوا نہ مجھے۔

اگلے ہی دن سے میں نے اُسی جنگل میں اُسی فاصلے پر چونّی اٹھنّی رکھ کر ان پر نشانہ لگانے کی مشق شروع کر دی۔ پڑوس سے کبھی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں آتیں، کبھی دھڑام دھڑام کی۔ چپکے سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جہاں میں اپنا نشانہ ٹھیک کرنے کی پریکٹس کر رہا تھا، وہاں چیتا بھی اپنی چھلانگ کی لمبائی اور رُخ صحیح کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس کا میں نے کسی سے ذکر کر دیا ہوگا جو کسی طرح مہاراجہ تک پہنچ گیا تو اُس نے مجھے خاص شکاری رکھ لیا۔ ساتھ ہی یہ بھی مشہور ہو گیا کہ میرا رابطہ ریاستی حکومت کی CABINET سے بھی ہے۔ کیبنٹ سے میرا تعلق ضرور تھا لیکن فقط اتنا کہ مہاراجہ کے خاص دفتر کی کیبنٹ اور اس کی کئی درازوں کو ہر ہفتے پالش کرا کے صاف ستھرا رکھا کروں۔

میں جانتا تھا کہ جیسے دیو سے مہا دیو بڑا ہوتا ہے، اس طرح مہاراجہ کو بھی معمولی راجہ سے بلند ہونا چاہیے۔ لیکن نہ جانے کیوں یہ مہاراجہ کافی کنجوس تھا۔ اتنا کہ جب اس نے مجھے اپنے مہمان خانے میں ٹھہرایا ہوا تھا، جہاں دونوں وقت دال کے سوا اور کوئی سالن نہ ملتا، تو ایک دن سورج گرہن کے سلسلے میں مجھ سے ہندی مہینے کی تاریخ پوچھ لی۔ میں فقط اتنا بتا سکا کہ اُس تاریخ کا تو پتہ نہیں لیکن دال کی آج بارھویں تاریخ ہے۔ اس پر وہ بظاہر تو خوش ہوا اور وزیر حضوری سے کہا کہ انہیں نوازا جائے۔ لیکن چند ہی دنوں میں مجھے سرحدی علاقے پر بھیج دیا گیا اور ایک دوسرا شخص ترقّی پر میری جگہ آ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مہاراجہ

کا سوتیلا بیٹا تھا۔ بعد میں دیکھا کہ عُہدوں پر اس کے رشتہ دار ہی رشتہ دار تھے۔ وہاں اقربا پروری کچھ اس طرح کی تھی جیسے ملکہ وکٹوریا خود اپنی خدمات کی تعریفیں کرتے ہوئے اپنے لئے پُرزور سفارش کر کے خود ہی اس کی تصدیق کریں اور پھر اپنے آپ کو وکٹوریا کراس کا اعلیٰ اعزاز مرحمت فرمائیں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"وہ نوکری چھوڑ دی۔ اگلی ملازمت ایک نواب صاحب کے ہاں کی۔ تیسرے چوتھے روز ہی سے پتہ چل گیا کہ انہیں مبالغہ کرنے کی عادت ہے۔ ہر بات کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ مجھ جیسے سیدھے سادے آدمی کو بہت عجیب لگتا۔ اکثر ڈینگیں مارتے رہتے۔ شکاری کے لئے اشتہار بھی انہوں نے یوں دیا تھا۔ 'نواب صاحب کے لئے جو خود بے حد بلند پائے کے شکاری ہیں۔ ضرورت ہے ایک نوعمر، چُست، پھرتیلے شکاری کی جسے کم از کم ساٹھ برس کا تجربہ ہو۔' جب گھُڑدوڑ میں ہارتے تو بڑے فخر سے بتاتے کہ میں تو ہمیشہ سب سے بہادر اور نڈر گھوڑے پر شرط لگاتا ہوں جو دوڑ کے بقیہ گھوڑوں کو آگے لگا کر ان کا خوب تعاقب کرتا ہے۔" ویسے انہیں شکار کا بالکل شوق نہیں تھا۔ کبھی کبھار شکاری پارٹی کے ساتھ تصویریں کھچوانے کے چاؤ میں جنگل جاتے تو فوٹوگرافی مکمل ہوتے ہی ہم ان کے ہاتھ سے بندوق واپس لے لیتے جو جانوروں کی بجائے خود

ان کے اور ہم سب کے لئے باعثِ خطرہ ہوتی۔ موٹے بہت تھے۔ اتنے کہ سوتے ہوئے جمائیاں لیا کرتے اور جاگتے وقت خرّاٹے۔ لیکن کبھی اپنا وزن بتانا پڑ جاتا تو یہی کہتے کہ ایک من اور کئی سیر۔ آخر ایک روز میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ انکی عمر اور رُتبے کو دیکھتے ہوئے اس مبالغہ آرائی پر کچھ کنٹرول ہونا چاہیے۔

بولے۔ "میاں تم ٹوک دیا کرو۔"

میں نے کہا کہ سب کے سامنے ٹوکنا اچھا معلوم نہیں ہو گا تو کہنے لگے کہ "اشارہ کر دینا میں سمجھ جاؤں گا۔ بس ذرا سا کھانس دیا کرنا۔"

اگلے روز انہوں نے کسی مگر مَچھ کا ذکر شروع کر دیا کہ "ہماری رعایا نے بے شمار درخواستیں دی ہیں کہ انہیں ایسے ظالم اور خونخوار مگر مَچھ سے نجات دلائی جائے جو پچاس فٹ لمبا ہے اور ہر وقت دریا کے کنارے انسان اور حیوان کی تاک میں رہتا ہے۔"

اس پر میں آہستہ سے کھانسا تو بولے۔ "خیر ہم نے اپنا سیکرٹری بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ مگر مَچھ فقط پچھتر فٹ لمبا تھا۔"

میں کھانسا تو فرمایا کہ "ہم نے سوچا کہ سُنی سُنائی باتوں کا اعتبار۔ بہتر ہو گا کہ خود جا کر ملاحظہ فرمائیں۔"

موقع پر پہنچ کر ایک ٹیلے سے اندازہ لگایا تو وہ تقریباً پینسٹھ فٹ لمبا لگا۔

میں نے پھر گلا صاف کیا تو کہنے لگے کہ "ہم نے اپنی پسندیدہ پرانی بندوق تھامی جو عمر میں ہم سے پانچ چھ برس بڑی ہو گی اور مگر مَچھ کے قریب پہنچے۔ اس کی لمبائی کم از کم پچپن فٹ معلوم ہوتی تھی۔"

میں کھانسا تو گویا ہوئے کہ "ہم نے شِست لی اور تقریباً بیس پچیس فائروں سے اُسے ہلاک کیا۔ اب جو نَپوایا تو مگر مَچھ پینتالیس فٹ لمبا نِکلا۔"

میں نے کھانسنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اُنہوں نے فوراً ٹوک دیا۔ "میاں تم کھانستے رہو، اب نَپ چکا ہے۔"

"نواب صاحب سچ کیوں نہیں بولتے تھے؟" ایک آواز آئی۔

"یہی سوال اُن کے ماموں نے اُن سے پوچھا تھا۔ نواب صاحب کا جواب یہ تھا کہ سچ فقط بچّے بولتے ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے۔ موقع اور حالات کے مطابق سچ پر بھی کانٹ چھانٹ اور حاشیہ آرائی کرنی پڑتی ہے۔"

پھر حُقّے کا کش لگا کر بتایا کہ "نواب صاحب جب فخر سے ہمیں بتاتے کہ وہ ہر روز آٹھ گھنٹے دربار کرتے ہیں اور سات گھنٹے عبادت، نو گھنٹے بھیس بدل کر رعایا کی شکایات معلوم کرنے نکل جاتے ہیں، چھ گھنٹے پڑوسی ملکوں کے نمائندوں سے ملاقات اور ان کی خاطر تواضع، چار گھنٹے مطالعہ وغیرہ وغیرہ۔ تو ہر روز چوبیس گھنٹوں کی بجائے ٹوٹل چھتیس یا اڑتیس گھنٹوں تک پہنچ جاتا۔"

"پھر آپ نے کیا کِیا؟"

"میں کچھ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ نواب صاحب کے معتمدِ خاص بخاری صاحب سے محض اتفاقاً بدمزگی ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بُلا کر قدرے کرخت لہجے میں حکم دیا کہ اُنہیں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے بخار چڑھنے والا ہو۔ لہٰذا میں اسی وقت طبیب کو حاضر کروں۔ نہ جانے کیوں سادگی میں میرے مُنہ سے یہ نکل گیا کہ آپ تو خود بخاری ہیں۔ بھلا بخار کی کیا مجال جو آپ کے قریب بھی آئے۔

اس کے علاوہ نواب صاحب نے اگلے روز اپنے دونوں بیٹوں سے تعارف کرایا۔ ان کے اتالیق کو بُرا بھلا کہا کہ اس نے دونوں سگے بھائیوں میں سے ایک کو ذہین قرار دیا تھا اور دوسرے کو کُند ذہن۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان دونوں کا فائنل امتحان لوں۔ میں نے بہتیرا کہا کہ میں تو معمولی سابق پولیس مین

اور شکاری ہوں۔ نہ میرے پاس کوئی ڈگری ہے۔ بھلا میں اس قسم کا امتحان کیسے لے سکتا ہوں۔

لیکن وہ مُصر رہے کہ تبھی تو میں تمہیں کہہ رہا ہوں کیونکہ تم غیر جانبدار ہو اور ثابت کر دوگے کہ سگے بھائیوں کی ذہانت ایک جیسی ہوتی ہے۔

میں نے وہ لڑکے دُور سے دیکھے تھے۔ ایک کے چہرے پر ذہانت کے آثار تھے اور دوسرا کچھ گھامڑ سا لگتا تھا۔

بہر حال نواب صاحب کا حکم تھا اور امتحان لینا پڑا۔ مجھے اور تو کچھ سجھائی نہ دیا۔ بس یونہی ان دونوں کو اصطبل کے ساتھ کی دو کوٹھریاں دکھائیں۔ ایک ایک روپیہ دیا اور کہا کہ اس روپے سے کچھ خرید جو پوری کوٹھڑی کو بھر دے۔

حسبِ توقع غبی لڑکے نے روپے کا گھاس اور بھُس خرید کر اندر فرش پر بچھا دیا۔ جب کہ ذہین نے ایک آنے کی موم بتّی جلا کر اپنی کوٹھڑی روشنی سے بھر دی۔

مجھے خاموش رہنا چاہیے تھا لیکن بس مُنہ سے نکل گیا کہ "اتالیق کا کہا درست ہے۔ آپ کے ایک بیٹے کا دماغ روشن ہے اور دوسرے کے سر میں بھُس بھرا ہوا ہے۔"

اس کے بعد حالات ایسے ہو گئے کہ نواب صاحب سے جدائی اختیار کرنی پڑی۔

"کبھی آپ کو کوئی کام کی ریاست بھی ملی؟" کسی نے پوچھا۔

"ہاں! لیکن اس کے راجہ کو پبلسٹی کا خبط تھا۔ اس کے واسطے ایک خاص عملہ رکھا ہوا تھا کہ ہر مہینے راجہ یا ریاست کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر اخباروں میں ضرور آجائے۔ اسے سلسلے میں افریقہ جانے کا پروگرام بنایا گیا اور مشہور کر دیا گیا کہ راجہ صاحب افریقہ کے حبشیوں اور دیگر غیر مسلّح قبائلیوں کے تحفّظ کے لئے وہاں کے خونخوار درندوں کا شکار کھیلے جا رہے ہیں۔ سمندر پار جانا کافی دلچسپ ثابت ہوا اور طرح طرح کی باتیں دیکھیں اور سیکھیں۔"

"مثلاً۔۔۔؟"

"مثلاً شمالی ساحلی علاقوں میں طوارغ نامی ایک قبیلہ دیکھا جس کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں مگر ہر لڑکا بالغ ہوتے ہی سیاہ نقاب پہنے لگتا ہے۔ غالباً دنیا بھر میں فقط یہی مرد ہیں جو ہر وقت چہرے پر نقاب رکھتے ہیں اور پھر کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں کے باشندوں کو نظر لگ جانے پر پورا اعتقاد ہے۔ نظرِ بد کو وہاں عین القبیحہ کہتے ہیں اور اس سے بچنے کے لئے ایک خاص قسم کا مَنکا پہنا جاتا ہے۔"

"وہاں آپ کو کسی لنگور، شُتر مُرغ، یا بَن مانس کی نظر تو نہیں لگی؟" ایک نوجوان نے پوچھا۔

"یہ وہی رنگین مَنکا ہے۔ کوشش کر لو مجھے تمہاری نظر بھی نہیں لگ سکتی۔" (شکاری نے بازو اُٹھا کر مَنکا دکھایا)۔۔۔ اور یہ کہ اُن کو لفظ مکتوب پر مکمل اعتقاد ہے۔ یعنی جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ لکھا جا چکا ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ ہر ناخوشگوار واقعے یا غمناک سانحے پر ممکن اور ناممکن وجوہات ڈھونڈنے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ کرتے تو یوں ہو جاتا۔ وہاں ایسی حالت میں وہ فقط دونوں ہاتھ ہلا کر "مکتوب" کہہ کر صبر کر لیتے ہیں۔ لیکن انہیں کامل یقین ہے کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔"

"لیکن ہمارے ہاں ڈاکخانے والے مکتوب الیہ کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔" وہی گستاخ آواز آئی۔

"یہ آپ ڈاکخانے کے محکمے سے پوچھیئے۔ تو ہوا یوں کہ اس علاقے میں ایک حبشی شکاری نے اپنے والد کا بتایا ہوا واقعہ سُنایا جس کا تعلق اس دور سے ہے جب انگریز اپنی وسیع برطانوی سلطنت کو اور بڑھانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ سکاٹ لینڈ سے ڈاکٹر لونگسٹن جو طبیب بھی تھا اور مشنری بھی، افریقہ آیا۔ وہ بیماروں کا علاج مُفت کرتا اور ساتھ ساتھ تبلیغ میں بھی مصروف رہتا۔ بہت جلد وہ اتنا مقبول ہوا کہ مقامی باشندوں کو اس سے والہانہ عقیدت ہو گئی۔ ایک دن وہ اسے ایک خاص تقریب پر لے گئے جہاں ہر سال مرد اپنی قوّتِ برداشت کا

مظاہرہ کیا کرتے۔ ایک شکاری نے کمان کا تیر اپنے بازو میں چبھو کر آر پار کر لیا اور اُف تک نہ کی۔ دوسرے نوجوان نے اپنی ران میں سے نیزہ گزار دیا اور چُپ رہا۔ تیسرا دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتا رہا۔ اسی طرح دیر تک مرد اپنی اور ہمّت کے یہ مظاہرے ہوتے رہے۔ پھر یکایک خاموشی طاری ہو گئی۔ اور سب اپنے محبوب ہیرو ڈاکٹر لونگسٹن کو جو ادھیڑ عمر کا تھا، دیکھنے لگے۔ جیسے کہ وہ اس سے کسی فوق البشر دلیرانہ کارنامے کی توقع رکھتے ہوں۔ پہلے تو وہ سمجھ نہ سکا لیکن جب صحیح پوزیشن کا علم ہوا تو مارے خوف کے پسینے میں بھیگ گیا۔ آخر اسے کچھ سوجھا اور ہتھوڑے اور آہنی سلاخ کی فرمائش کی۔ سلاخ اپنے جبڑے کی داہنی طرف رکھ کر ہتھوڑے سے جھوٹ مُوٹ ضربیں لگائیں۔ پھر سامنے اور بائیں طرف بھی یہی کیا۔ اس کے بعد محض دِکھاوے کے لئے اپنے مُنہ میں انگلیاں ڈال کر مسوڑھوں سے کھینچا تانی کی اور بظاہر اپنی پوری قوّت صرف کر کے اپنے مصنوعی دانتوں کی بتیسی نکال کر سب کے سامنے کر دی۔ حبشیوں نے کبھی مصنوعی دانت نہیں دیکھے تھے۔ اس کارِ نمایاں پر سارا ہجوم ڈاکٹر کے سامنے جھک گیا جیسے اسے چمپئین مان لیا ہو۔“

”آپ نے راجہ کا ذکر نہیں کیا۔“

"راجہ باقاعدہ طور پر ڈرپوک تو نہیں تھا۔ بہر حال اس دلیر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ شیروں، گینڈوں، جنگلی ہاتھیوں کو مارنا تو بڑی بات ہے ان کے سامنے کھڑے ہونے کے لئے بھی ہمّت چاہیے اور پھر یہ کہ شکار فوراً ہی نہیں مل جاتا۔ کتنی ہی مرتبہ یہ ہوا کہ دوپہر سے کسی تیندوے کی سمت میں شِست لئے کھڑا ہوں اور وہ جھاڑیوں میں چھُپا ہوا ہے۔ انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ تیندوا اور سورج دونوں جھاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گئے۔

کچھ جانور ایسے بھی ملے جو انسانوں کی طرح شرارتیں کرنے کے عادی تھے۔ مثلاً ایک خطرناک جنگلی اُود بلاؤ جب میرے تعاقب کی زد سے آگے نکل گیا تو اونچے سے درخت پر چڑھ کر کبھی مجھے ٹھینگا دکھاتا، کبھی زبان نکال کر بیہودہ اور غیر شائستہ آوازیں نکالتا۔ اور ایک رات ہانکا کرنے والے ڈھول بجا بجا کر، مشعلیں دکھا کر ایک چیتے کو ایسی موزوں جگہ گھیر لائے جس کے پیچھے بڑا اسارادریا تھا اور چیتے کا فرار ہونا بظاہر ناممکن تھا۔ بغیر کسی آہٹ کے میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ تلاش کرنے کے بعد دیکھا کہ جھاڑ جھنکاڑ کی دوسری طرف دو آنکھیں چمک رہی ہیں۔ یہ کسی ایسے چیتے کی معلوم ہوتی تھیں جس کی تھوتھنی اور پیشانی بڑی کشادہ ہو کیونکہ ایک آنکھ دوسری آنکھ سے خاصی دُور تھی۔

میں نے اطمینان سے دونوں آنکھوں کے نشانہ لے کر فائز کیا لیکن کچھ نہ ہوا۔ پھر آگے بڑھ کر رائفل کو اپنی فولادی چھڑی کا سہارا دیا اور سانس روک کر بالکل اس کے ماتھے پر فائر کیا۔ نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آگے بڑھ کر اور فائر کئے۔ حتیٰ کہ کارتوس ختم ہو گئے۔

مجھے اتنا غصّہ آیا کہ رائفل کو بطور لٹھ لے کر درندے پر حملہ آور ہوا تو پتہ چلا کہ سامنے دو بھیڑیے تھے جنہوں نے ایک ایک آنکھ بند کر رکھی تھی۔

مجھے علم تھا کہ رات کو تقریباً سارے جانوروں کی آنکھیں چمکتی ہیں، لیکن ایسے خبیث بھیڑیوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا جنہوں نے میرے قیمتی کارتوس ناحق ضائع کرا دیئے۔ انہیں رائفل سے زدوکوب کرنا چاہا تو بھاگ گئے۔"

"آپ نے راجہ کا ذکر شروع کیا تھا۔"

"ہاں تو پبلسٹی کے لئے جنگل میں عارضی کیمپ لگایا گیا۔ دِن میں تصویریں اُتاری جاتیں۔ اُدھر رات ہوتے ہی چرخ جسے لگڑ بگڑ بھی کہا جاتا ہے، اس کی بھیانک ہنسی کی کرخت آواز آنی شروع ہو جاتی اور اتفاق سے یہ مکروہ جانور مہاراجہ کے خیمے کے گرد ہی چکر لگاتا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ ٹارچ والی رائفل سے اس کو ٹھکانے لگاؤں۔ آدھی رات کے قریب جب اس نے شور مچانا شروع کیا تو میں

نے رائفل سنبھالی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی شکل نظر آئی۔ فائر کرنے ہی لگا تھا کہ ارادہ بدل دیا اور یونہی آسمان کی طرف رائفل چلا دی۔ وہ ڈر کر بھاگ گیا اور غالباً راجہ مطمئن ہو گیا۔ لیکن اگلی رات پھر اسی مُردود جانور کی آواز آتی رہی۔ صبح ناشتے پر راجہ نے مجھ سے پوچھا۔ ویسے میں با آسانی جھوٹ بول سکتا تھا کہ یہ کوئی دوسرا الگڑ بگڑ ہو گا۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں، چنانچہ صاف صاف بتا دیا کہ جونہی فائر کرتے وقت ٹارچ کی روشنی ڈالی تو اس جانور کا چہرہ بالکل صاف نظر آیا، لیکن میں فائر نہ کر سکا۔

راجہ نے وجہ دریافت کی تو میں نے بتایا کہ اس کا مُنہ بالکل راجہ کے پریس سیکرٹری کے چہرے سے ملتا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کیوں سیکرٹری نے مجھ سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ حالانکہ میں نے حقیقت بیان کی تھی۔۔۔"

"اُس خطّے میں اور شکاری بھی تو آتے ہوں گے۔ آپ کا کسی سے مقابلہ نہیں ہوا؟"

"مغربی ملکوں سے اکثر شکاری شیر کے شکار کے لئے آیا کرتے۔ لفظ 'سفر' کو انہوں نے SAFARI میں ڈھال رکھا تھا۔ اُنہیں بھی پبلسٹی کا خبط ہوتا۔ ہر ایک کے پاس چھ چھ سات سات کیمرے ہوا کرتے۔ وہ چار یا پانچ افراد کا جتھّا بنا کر مچان اور مورچے سے شیر کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے۔ مغربی ممالک

میں ہر کام میں پھُرتی دکھانے کا رواج ہے چنانچہ وہ اتنی جلد بازی سے کام لیتے کہ عموماً آخری سکور کچھ یوں ہوا کرتا۔

شکار۔۔صفر

شیر۔۔چار یا پانچ شکاری'

"آپ نے کبھی راجے کو بھی شکار کھیلنے دیا؟"

"ہاں ایک روز مقامی لوگوں سے مِل کر چیتے کے شکار کا انتظام کیا گیا۔ پتہ نہیں کس نے راجہ کے کان میں پھونک دیا کہ چیتا انسان پر تب ہی حملہ کرتا ہے جب اسے بھوک لگی ہو ورنہ نہیں۔ اُونچے مچان پر راجہ اور میں بالکل محفوظ تھے مگر وہ بار بار پوچھتا کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ چیتا بھوکا ہے یا نہیں؟ اتفاق سے اس روز مجھے زکام تھا جس سے بڑے بڑے پہلوان بھی چِڑ چِڑے ہو جاتے ہیں۔ جب اس نے کوئی بیسویں مرتبہ یہ سوال کیا تو میرے مُنہ سے نکل گیا کہ اگر چیتا آپ کو کھالے تو سمجھ لیجئے کہ یہ بھوکا تھا۔ اس معمولی سے فقرے سے پردیس میں کچھ ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی جو واپس وطن پہنچ کر بھی دُور نہ ہو سکی۔ آیئے آیئے اپنے دونوں پاؤں پر جو بھاری بوجھ اُٹھا رکھا ہے اسے ہلکا کرنے کے لئے تشریف رکھیئے۔۔۔ بے وقوف حقّہ اس طرح بھرتے ہیں؟ اناڑی کہیں کا۔۔" شکاری

صاحب کا پہلا فقرہ بھاری بھر کم زمیندار کے لئے تھا اور دوسرا نمبر دار کے ملازم کے لئے۔

"آپ تو بھُوت کا قصّہ سُنانے والے تھے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"پولیس کی ملازمت کے دوران جب بھی باہر جاتا تو رات کو کبھی کبھی ایسی جگہ بھی بسیرا ہوتا جو آسیب زدہ مشہور ہوئی۔ بھُوتوں کے معتقد بتاتے کہ جس طرح دنیا بھر میں کسی بھی دو آدمیوں کے انگوٹھوں کے نشان ایک دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح بھُوت بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ بھُوت انسانوں کو دیکھ کر ٹل جاتے ہیں، کچھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار میز، کرسیاں، چارپائی وغیرہ گھسیٹ کر کر دیتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنھوں نے انسانوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے لیکن اب تک کسی آسیب زدہ مکان میں آسیب نہیں دیکھا۔۔۔"

"گھاٹ پر تو چوپائے پانی پیا کرتے ہیں۔" وہی جانی پہچانی آواز آئی۔

شکاری نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے کسی اور سے پوچھا۔ "تم اُونگھ رہے ہو؟"

"نہیں تو۔۔۔"

"بھلا میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"شاید سیبوں کا ذکر ہو رہا تھا۔"

"سیب؟"

"آسیب آسیب کئی بار سُنا۔"

اتنے میں ملازم دوبارہ حقّہ بھر کر لایا۔ شکاری نے کئی کش لگائے اور اس مرتبہ حُقّے کو فِٹ قرار دیا۔

اور ان آسیب زدہ مکانوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں پڑوسیوں نے جان بوجھ کر بدنام کر رکھا تھا تاکہ کوئی کرائے دار نہ آ سکے۔ اگر آتا تو رات کو پتھر پھینک کر یا پراسرار روشنیوں اور آوازوں سے ڈرا دیتے۔ اس لئے کہ مکان خالی رہے اور ضرورت پڑنے پر استعمال کیا جا سکے۔ جب کبھی مجھے کسی آسیب زدہ عمارت میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا تو خوفناک کہانیوں سے پہلے ہی اتنا ڈرا دیا جاتا کہ رات ہوتے ہی کچھ نہ کچھ نظر آنے لگتا۔ ایک دفعہ جب میں سونے کی کوشش کر رہا تھا تو سامنے کی دیوار پر ایک مگرمَچھ دکھائی دیا۔ سوچا کہ مگرمَچھ پانی کے قریب ہوا کرتا ہے۔ اس کا دیوار پر چڑھنا تو بالکل ناممکن ہے۔ لیکن سامنے ہو بہو مگرمَچھ تھا۔ پھر اس نے ایک لومڑی نما چیز کا تعاقب کیا۔ ہمّت کر کے اُٹھا تو دیکھا کہ

دوسرے کمرے کی روشنی ایک پیالہ نما شیشے اور چوکی پر اس طرح پڑ رہی تھی کہ ہر شے کا عکس کئی گنا نظر آرہا تھا اور یہ کہ چھپکلی نے ایک بھُنگے کا تعاقب کیا تھا۔

پھر اسی قسم کے ایک اور مکان کے ایک کمرے میں سونا پڑا جسے وہ ڈرائنگ روم کہہ رہے تھے۔ لیکن مجھے وہاں ڈرائنگ کا کوئی سامان نہیں ملا۔ آنکھیں بند کرکے نیند کا انتظار کرنے لگا۔ دن بھر جو خرافات سُنی تھی وہ کانوں میں گونج رہی تھی۔ دفعتاً کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پانچ فٹ اُونچی شبیہ دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ شاید آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ میں جوانی میں پہلوان بھی رہ چکا ہوں۔ میں نے کروٹ بدل لی کہ اسے نظر انداز کروں تو شاید یہ ٹل جائے۔ لیکن وہ نہیں ہٹی، جیسے خم ٹھونک کر میرا انتظار کر رہی ہو۔ آخر دھوبی پٹڑا، قینچی، اُلٹی یا کسی اور داد پیچ سے اسے ہرانے کے لئے اُٹھنا ہی پڑا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا وہ چیز بھی میری طرف حملہ آور ہوتی۔ آخر میں نے چھلانگ لگا کر ڈبل KICK ماری۔ چشمِ زدن میں میں اُوپر تھا اور بجلی کا بڑا فرشی پنکھا میرے نیچے۔ اور اس کے تاروں میں میرے پاؤں الجھے ہوئے تھے۔ ایک اور آسیب زدہ مکان میں خوف سے یوں محسوس ہوا کہ اپنی ٹانگ گنوا بیٹھا ہوں۔ پھر پتہ چلا کہ کشادہ سا جامہ پہنتے وقت جلدی میں دہنی طرف دونوں ٹانگیں پھنسا دی تھیں اور بایاں پائنچہ خالی پڑا تھا جسے ٹٹول ٹٹول کر ڈرتا رہا۔ ایسے ہی کئی واقعات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ آسیب وغیرہ سب فرضی ہیں۔“

"لیکن آپ تو کسی بھُوت کا قصہ سنانے لگے تھے۔"

"ہاں! ریٹائر ہو کر جب اس چھوٹے سے گاؤں میں کھیتی باڑی شروع کی تو وہم و گمان تک نہ تھا کہ یہاں ایک سچ مچ کے بھُوت سے واسطہ پڑے گا۔ اور بھُوت بھی ایسا جو یونہی بلاوجہ پیچھے پڑ جائے۔ نہ میں نے اسے کبھی چھیڑا، نہ خفا ہونے کا موقع دیا۔ بلکہ وہ اور میں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ ہوا یوں کہ ایک ہفتے اپنے کھیتوں کو پانی دینے کی باری رات کو آئی۔ گھڑی دیکھ کر پورے ساڑھے دس بجے گھر سے نکلا۔ سڑک والا راستہ ذرا لمبا تھا اور میں شکار کھیل کر کچھ تھکا ہوا سا تھا اس لئے سوچا کہ پگڈنڈی والے چھوٹے رستے سے نکل جاؤں تو جلد پہنچ جاؤں گا۔ دو اڑھائی مربعوں کے بعد پرانی شمشان آتی ہے۔ وہاں جو کیکر کے چار درخت ہیں ان کے پاس سے گزرتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں تیز چلنے لگا۔ اس نے بھی رفتار تیز کر دی۔ میں آہستہ ہوا، تو وہ بھی آہستہ ہو گیا۔ گھبرا کر میں نے بھاگنا شروع کیا۔ وہ بھی سرپٹ بھاگا۔ میری ہمّت جواب دے رہی تھی۔ آخر میں رُک گیا۔ وہ بھی رُک گیا۔ آپ سے کیا چھپانا۔ خوف سے میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک عجیب سی شبیہ سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی ہے۔ ڈر کے مارے میرے مُنہ سے نکلا۔ "ہی ہی ہی ہی۔" اس نے بھی اسی طرح ہی ہی ہی ہی کہا۔ دیکھنے میں وہ ایک اوسط درجے کا بھُوت تھا۔ لیکن اس کی شکل نہ تو اچھی تھی اور

نہ زیادہ ڈراؤنی۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر کانپتے اور ہی ہی ہی کرتے رہے۔ آخر میں نے دلیر بننے کی کوشش میں اپنے آپ سے کہا۔۔ ''چلو بھئی گیارہ بجے پانی لگانا ہے۔'' اُس نے فوراً نقل اُتارتے ہوئے کہا۔ ''چلو بھئی گیارہ بجے پانی لگانا ہے۔'' میں اپنے کھیتوں کی طرف چل دیا۔ وہ بھی پیچھے ہو لیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے کُدال سے نالے میں شگاف کیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے لیکن اس نے میری نقل اُتاری۔ کھیت میں پانی آنے لگا اور میں ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی سامنے آ بیٹھا اور مجھے گھُورنے لگا۔ اس کے لگاتار گھُورنے پر آہستہ آہستہ میرا ڈر کم ہوتا جارہا تھا اور اب مجھے غصّہ آرہا تھا۔ آخر یہ بھُوت چاہتا کیا ہے؟ کیا یہ نہیں جانتا کہ شریف آدمیوں کو خواہ مخواہ گھُورنا نہ صرف آداب کے خلاف ہے بلکہ انتہائی درجے کی بدتمیزی ہے؟ پورے تین گھنٹے پانی دینا تھا اور پورے تین گھنٹے وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے یہی سوچا کہ ایسے غیر مہذّب بھُوت کا کوئی نوٹس نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ اپنی نگاہیں اِدھر اُدھر رکھیں، حتیٰ کہ ڈھائی بج گئے۔ پھر گھڑی دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ ''اب پانی بند کر کے گھر چلتے ہیں۔'' اس نے بھی اپنی خالی کلائی کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''اب پانی بند کر کے گھر چلتے ہیں۔'' واپسی پر وہ شمشان تک ساتھ آیا اور کیکر کے چار درختوں کے پاس غائب ہو گیا۔ کئی دِنوں تک میں اس واقعے کے متعلق سوچتا رہا۔

اگلے ہفتے جب رات کو پانی لگانے کی باری آئی تو مجھے سڑک سے جانا چاہیے تھا۔ پھر یونہی خیال آیا کہ شاید یہ نِرا وہم ہو یا بھُوت کو غلط فہمی ہوئی ہو اور اس نے مجھے کوئی اور شخص سمجھا ہو۔ میں دوبارہ شمشان والے راستے سے گزرا۔ کیکر کے درختوں کے بعد میں اور بھُوت آگے پیچھے چل رہے تھے۔ مچھّر اُڑا کر میں نے اپنی گردن کھجائی۔ اُس نے بھی بالکل یہی کیا۔ میں نے چھینکیں ماریں۔ اس نے بھی کوشش کر کے دو ہلکی سی چھینکیں ماریں۔ میں کھانسا، وہ بھی کھانسا۔ غصّہ تو مجھے تب آیا جب میں نے ایک فلمی گانا شروع کیا اور اس نے نہایت بے سُری آواز میں نقل اُتاری۔ دوست احباب سب جانتے ہیں کہ ماشاء اللہ میری آواز سریلی ہے اور دُھنوں سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ ایسے نفیس گیت کا یوں ستیاناس ہوتے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ فوراً اگلے روز ایک پہنچے ہوئے بزرگ کے پاس گیا اور درخواست کی کہ ایسے بد تمیز اور بد ذوق بھُوت سے میرا پیچھا چھڑائیے۔ انہوں نے میرے لئے دُعا مانگی اور ایک تعویذ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اسے دہنے بازو پر باندھ لوں۔ پھر کچھ سوچ کر تعویذ واپس لے لیا اور بولے کہ "اگر بھُوت ہو بہو وہی کچھ کرتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو تو اس سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس سے کھیتوں میں گوڈی کراؤ۔" چنانچہ رات کو دو کھرپے، دو درانتیاں اور دیگر مطلوبہ چیزیں سنبھالیں اور شمشان کی طرف چل دیا۔ کیکر کے درختوں سے بھُوت کو ساتھ لیا اور کھیتوں میں گوڈی شروع کر دی۔ نقل اُتارنے

میں تو وہ اُستاد تھا۔ فالتو کھُرپہ پکڑ کر فوراً گوڈی کرنے لگا۔ تھک کر میں ماتھے سے پسینہ پونچھتا تو وہ بھی اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا۔ میں نے درانتی چلائی تو اس نے زائد درانتی اُٹھالی۔ میں کام چھوڑ کر سانس لینے بیٹھا تو وہ بھی ہانپتا ہوا میرے ساتھ آ بیٹھا اور گھورنے لگتا۔ پھر ہم دونوں سرگرمی سے اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔ تب میں نے سوچا کہ شاید یہ بھُوت اتنا بُرا نہیں ہے۔ فقط اسے گھورنے کی عادت کہیں سے پڑ گئی ہے۔ اگر کسی طرح یہ بیہودہ عادت چھڑُا دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ اچھا خاصا معقول بھُوت نہ بن سکے۔ ممکن ہے کہ ناسازگار حالات اور لگاتار تنہائی کی وجہ سے یہ ایسا ہو گیا ہے یا شاید اسے رفاقت کی تلاش ہو۔ ویسے وہ نہ صرف محنتی بھُوت ہے بلکہ وقت کا پابند بھی ہے۔ یہ خوبی انسانوں میں بہت کم ملتی ہے اور اِدھر میں کھیتی باڑی کرنے کے لئے یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ ان دِنوں میرا کوئی مددگار بھی نہیں۔ اگر یہ میرا ہاتھ بٹانے کو تیار ہو تو اسے ہر مہینے کچھ تنخواہ دے دیا کروں گا۔ چنانچہ اسے

اُتم کھیتی، مدھم بیوپار

نکھِد چاکری، بھیک ندارد

والی مشہور کہاوت سُنائی جسے اُس نے فوراً دوہرایا۔ صبح کے چار بجے تک میں نے اُس سے خوب کام لیا۔ پھر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ”بہت تھک گئے۔ اب چلنا

چاہیے۔" وہ بھی انگڑائی لے کر بولا۔ "بہت تھک گئے۔ اب چلنا چاہیے۔" میں خوش خوش گھر پہنچا کہ ایک اچھا اسسٹنٹ مل گیا ہے لیکن اگلے دن جو کھیتوں کو دیکھتا ہوں تو گوڈی فقط اس حصّے میں ہوئی تھی جس میں مَیں نے کام کیا تھا۔ جس حصّے میں بھُوت ہاتھ چلاتا رہا بدستور گھاس پھونس سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اس قدر غصّہ آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ سیدھا اُن بزرگ کے پاس گیا اور التجا کی کہ ایسے کام چور نکمّے بھُوت کی میں شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر فرمایا کہ اسے ایک چانس اور دینا چاہیے۔ شاید اسے گوڈی کرنی نہ آتی ہو یا گوڈی پسند نہ ہو۔ اس سے ہل چلوا کر بھی دیکھ لو۔ اس کے بعد اگلی مرتبہ سہ پہر کو ایک فالتو ہل مَیں کھیت میں چھوڑ آیا اور دو بیل بھی وہیں باندھ دیئے۔ رات کو بیل وغیرہ لے کر چلا۔ کیکر کے درخت سے بھُوت کو ساتھ لیا اور صبح کا ستارہ طلوع ہونے تک ہم دونوں ہل چلاتے رہے۔ لیکن جب اگلے دِن جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحیح ہل صرف میں نے چلایا تھا۔ اس کے حصّے میں صرف بیلوں کے کھُروں کے نشان تھے، ہل بالکل نہیں چلا تھا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بھُوت سُدھرنے کی سٹیج سے گزر چکا ہے۔ بزرگ سے درخواست کی کہ اس حیلہ ساز بھُوت سے جو سارے بھُوتوں کے لئے باعثِ ننگ ہے، میری خلاصی کرائے۔ انہوں نے حسبِ معمول میرے لئے دُعا مانگی اور ایک تعویذ دیا کہ اسے بائیں بازو پر باندھ لوں۔ پھر کچھ سوچ کر تعویذ واپس لے لیا اور میرے کان میں

سر گوشیاں کیں۔ میں یہ بتانا بھُول گیا کہ وہ بھُوت روز بروز بد تمیز ہوتا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رہتا۔ اب قریب آتے آتے بالکل ساتھ آ کھڑا ہوتا۔ منہ چڑاتا، نقلیں اُتارتا۔ غرضیکہ ایسی بے تکلّفی برتتا جیسے برسوں کا واقف بھُوت ہو۔ اِدھر میری حالت یہ ہو چکی تھی کہ روزِ روشن میں بھی سڑک پر چلتے چلتے یہ شُبہ رہتا کہ کوئی پیچھے آ رہا ہے۔ کسی سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا کہ کہیں یہ نقل نہ اُتارنے لگے۔

میں نے بزرگ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایک کھیت میں دو گڑھے کھودے۔ پہلے کو فقط مٹّی اور راکھ سے بھرا اور اُوپر بڑی ساری اینٹ رکھ دی۔ دوسرے میں مغرب سے پہلے کوئلے اور لکڑیاں ڈال کر انہیں خُوب سُلگایا۔ پھر اُوپر راکھ ڈال کر ویسی ہی اینٹ رکھ دی۔ رات ہوتے ہی شمشان کا رُخ کیا۔ درختوں کے پاس بھُوت منتظر ملا۔ اُسے ساتھ لے کر کھیتوں میں پہنچا۔ اس رات طرح طرح کے تماشے کئے۔ میں نے چھلانگیں لگائیں، اُس نے بھی لگائیں۔ میں نے بیٹھکیں نکالیں، ڈنٹر نکالے۔ اس نے فوراً نقل اُتاری۔ پھر نئی نئی فلمی دُھنیں گائیں اور اُس نے اچھے بھلے گانوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ ورزش کا پروگرام دوبارہ شروع کیا گیا جو دیر تک رہا۔ آخر میں تھک کر چُور ہو گیا۔ اُدھر بھُوت کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ آخر میں نے جمائی لے کر کہا۔ ”تھک گئے بھئی۔ کہیں بیٹھ کر ستا لیں۔“ وہ بھی گڑھوں کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ ”کہیں بیٹھ کر ستا

لیں۔" میں جلدی سے ٹھنڈی اینٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی جلدی سے دوسری اینٹ پر بیٹھا جو راکھ سے ڈھکی ہوئی تھی مگر دہک رہی تھی۔ بیٹھتے ہی اُس نے زور سے نعرہ بلند کیا۔ آپ سب تو جانتے ہی ہیں کہ بھُوت آگ سے ڈرتے ہیں۔ قصّہ مختصر اُس رات وہ ایسا غائب ہوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کے بعد میں رات کو بارہا شمشان کی طرف سے گزرا لیکن وہ کبھی نہیں دکھائی دیا۔"

شکاری صاحب نے کہانی ختم کر کے مونچھوں کو تاؤ دیا اور حُقّے کے کش لگانے لگے۔

"آپ نے اس سے چھٹکارا تو پا لیا۔ لیکن گرم سرد اینٹوں کے سلسلے میں سپورٹس مین سپرٹ نہیں دکھائی۔" وہی نوجوان بولا۔

"برخوردار تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سپورٹس مین سپرٹ وہ نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ سپورٹس مین اب رقم لے کر کھیلتے ہیں اور سپرٹ ممنوع ہے۔

ہم نے نمبر دار صاحب کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کبھی کے جا چکے ہیں۔ واپسی پر کتّوں کے لشکر نے ہمیں پھر گھیر لیا اور میں نے اِس پھُرتی سے لٹھ گھمایا کہ وار میرے دوست کی کمر پر پڑا۔ گُڑ کی پوٹلی اس کے ہاتھ سے نالے میں گر گئی اور ہم

سرپٹ اپنے گاؤں کی طرف بھاگے۔ رستے میں ہم نے فیصلہ کیا کہ گھر والوں سے کہہ دیں گے کہ گُڑ کتّے کھا گئے اور لالٹین بھی انہی نے توڑ دی۔

ہمیں سڑک والا لمبا راستہ لینا چاہیے تھا لیکن جلدی میں سیدھے پگڈنڈی پر کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ شمشان کے قریب جب کیکر کے چار درخت آئے تو ہم بالکل نہیں ڈرے کیونکہ اب ہمیں بھُوتوں کو رفع کرنے کا آزمودہ اور آسان ترین نسخہ معلوم تھا۔

کون کیا ہے؟

"کون کیا ہے (who is who) کے عنوان سے مشہور ہستیوں کے حالاتِ زندگی اکثر چھپتے ہیں، جنہیں بہت لوگ زیادہ شوق سے نہیں پڑھتے اور اکثر شکایت کرتے ہیں کہ کچھ تشنگی سی رہ جاتی ہے۔ شاید اس لئے کہ فقط ان ہستیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنہیں پبلک پہلے سے جانتی ہے، یا اس لئے کہ ان ہستیوں کی فقط تعریفیں ہی تعریفیں کی جاتی ہیں۔

زمانہ بدل چکا ہے۔ قدریں بھی بدل چکی ہیں۔ غالباً ان دنوں پڑھنے والے سوانح عمری کی سُرخیاں ہی نہیں جاننا چاہتے، وہ کچھ اور باتیں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ان کی رائے میں غیر معروف ہستیاں بھی تو توجّہ کی مستحق ہیں۔

چنانچہ نئے تقاضوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے "کون کیا ہے" کچھ یوں بھی مرتب کیا جا سکتا ہے:

ازبر رومانی

۱۹۶۰ء میں جوان ہوئے۔

آپ کے شاعر بننے کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور ہیں (جن میں سے کچھ تو بالکل غلط ہیں)۔ سُنا ہے کہ ۶۴ء میں کسی لڑکی پر خواہ مخواہ عاشق ہو گئے تھے۔ محبوبہ نے شاعری کی قدیم روایات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انہیں خوب ستایا۔ پھر ۶۵ء میں کہیں غائب ہو گئی۔ محبوب کے چلے جانے کے بعد ان کی زندگی بالکل سنسان ہو گئی اور کچھ بھی نہ رہا سوائے ان کی بیوی اور پانچ بچّوں کے۔

۶۶ء میں محبّت سے بیزار ہو کر لڑکیوں کے تعلق سوچنا چھوڑ دیا۔ (اور عورتوں کے بارے میں سوچنے لگے)۔

بڑے نازک مزاج ہیں۔ ایک دعوت میں سری پائے نوش کئے تو ذرا دیر بعد سر میں درد ہو گیا اور پاؤں میں موچ آگئی۔

فقط رومانی چیزیں کہتے ہیں جو فلمی پرچوں کی زینت بنتی ہیں۔

آپ بہت ہر دلعزیز ہیں۔ بڑی بڑی محفلوں میں جا چکے ہیں، فقط ایک مرتبہ۔

جدید شاعری سے دُور رہتے ہیں۔ چنانچہ 'زنداں'، 'خرابے'، 'خوناب'، 'سامراج'، 'طبقاتی شعور'، 'سُرخ سویرا'، 'سبز دوپہر'، 'عظمتِ آدم'، 'ذلّتِ مردم' اس قسم کی چیزوں کے پاس نہیں پھٹکتے۔

اظہر سماجی

آپ بھی شاعر ہیں اور 'زنداں'، 'خرابے'، 'خوناب'، 'سامراج'، 'طبقاتی شعور' وغیرہ پر جان چھڑکتے ہیں۔ دراصل آپ شاعری اس لئے کرتے ہیں کہ از بر رومانی کی خبر لے سکیں۔
جس دن از بر صاحب نے شاعری چھوڑ دی، آپ بھی ترک کر دیں گے اور اپنا وقت کسی بہتر مشغلے میں صرف کیا کریں گے۔

آغا کلیم اختر

صدیوں سے آپ کا خاندان پٹیالہ اور بٹھنڈے کے درمیانی علاقے میں رہتا رہا ہے۔ آپ کے بزرگوں میں سے کوئی بھی دریائے سندھ کے پار نہیں گیا، پھر بھی آپ نے (یکلخت امیر ہو جانے پر) اپنے نام کے ساتھ آغا لگا لیا۔
آپ کا جنرل نالج بے حد وسیع ہے۔ محلّے کا کوئی (غیر اہم) واقعہ ایسا نہیں جو آپ کو معلوم نہ ہو۔ شہر کی کوئی اوٹ پٹانگ بات آپ سے پوشیدہ نہیں۔
آپ جانتے ہیں کہ دعوتوں میں چوہدری صاحب سے لوگ متاثر محض اس لئے ہوتے کیونکہ موصوف بالکل خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور یہ کہ خواجہ جو اتنے موٹے ہیں یا ہر وقت بھُوک اُڑ جانے کی شکایت کرتے رہتے ہے کہ وہ سوائے ناشتے، لنچ اور ڈنر کے کچھ بھی تو نہیں کھاتے۔ آپ کو بھی پتہ ہے کہ پڑوسیوں

کے ہاں شور مچنا بند کیوں ہو گیا ہے اور شیخ صاحب خواہ مخواہ خوش اس لئے رہنے لگے ہیں کہ قنوطی لوگوں سے اُدھار لینا شروع کر دیا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ قنوطی کو قرض کی واپسی کی اُمید نہیں ہوتی۔

آپ کو خان صاحب کے استعفیٰ نہ دینے کی اصل وجہ معلوم ہے۔ وہ یہ کہ خان صاحب کہیں ملازم ہی نہیں تھے اور یہ کہ شاہ صاحب اتنے کنجوس ہیں کہ جب تندرست ہوئے اور ڈاکٹر صاحب نے بیس روپے فی VISIT کے حساب سے دو سو پچاس کا بِل بھیجا تو آپ نے واپس کر دیا اور لکھا کہ دس کی جگہ میں آپ کو پندرہ مرتبہ VISIT کروں گا۔

کسی نے آپ کی افواہ پروری پر اعتراض کیا تو کہنے لگے کہ یہ تو مشرقی ممالک کا محبوب مشغلہ ہے۔

۱۹۴۶ء میں آپ نے انکشاف کیا کہ شیخ صاحب کا کُنبہ خاصا دلچسپ ہے۔ شیخ صاحب کا پرانا نام ڈیوڈ فتّو مل اور ان کے سالے کا نام رابرٹ طوطا رام تھا۔ مالی حالت بہتر ہونے پر دونوں علی الترتیب فتح سین اور تیرتھ سین بن گئے۔ ایک نے مارگریٹ کماری سے شادی کی اور دوسرے نے کسی اور سے۔

مالی حالت اور سُدھری تو آپ فتح ایس شیخ کہلائے وغیرہ وغیرہ۔

اس خبر پر سب خوش ہوئے لیکن شیخ صاحب نے (جنہیں اپنے اصلی شیخ ہونے پر فخر ہے) بے حد خفا ہو کر بیان دیا کہ اب وہ نہ آغا دیکھیں گے نہ پیچھا۔ فوراً ہتکِ عزّت کا دعویٰ کریں گے۔

لیکن اس کا نتیجہ (حسبِ معمول) کچھ نہ نکلا۔ ملکہ کئی برس تک پیشیوں پر اس قدر خرچ ہوا کہ تنگ آ کر صلح کرنی پڑی۔

اسی سال آپ بڑی سفارشوں کے بعد مقامی کلب کے ممبر بنے۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد دیگر ممبروں نے اعتراض کیا کہ آپ سہ پہر سے آدھی رات تک کلب میں رہتے ہیں مگر ایک پائی تک خرچ نہیں کرتے۔ (غالباً آپ BAR پر جانے والوں کو گننے اور رقص میں شامل ہونے والوں کو جھانکنے کے لئے ممبر بنے تھے)۔

۴۷ء میں بیان دیا کہ الحاج اللہ دِتّہ صاحب نے دراصل حج نہیں کیا۔ وہ بمبئی تک حج کرنے والوں کے ساتھ ضرور گئے تھے لیکن تجارت کے سلسلے میں وہیں ٹھہر گئے اور پھر کچھ عرصے کے بعد حاجیوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ اگر حج کیا ہوتا تو ان کے پاس سونے کی بے شمار گھڑیاں اور دیگر بیش قیمت اشیا ہونی چاہیے تھیں۔

اس خبر پر بھی سب خوش ہوئے۔ (سوائے حاجی اللہ دِتّہ کے)۔

جن لوگوں کو اپنے بلڈ پریشر کا ذرا سا بھی لحاظ ہے وہ آپ کے قریب نہیں آتے۔ چُستی کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے پولیس کے دو سپاہیوں کو گرفتار کرا دیا تھا۔

کبھی کبھی بدخواہوں سے بچنے کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے لئے بہترین دُعا یہ ہو گی "خدایا مجھے مجھ سے محفوظ رکھ"۔ مشہور ہے کہ سوتے وقت بھی آپ کی ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔

بی ایل مفکّر

سُنا ہے کہ بچپن میں بلا کے ذہین تھے۔ شاید یہ غور و خوض کی عادت تھی جس نے بعد میں تجسس و تشویش کی شکل اختیار کر لی اور اب آپ ہر وقت کسی نہ کسی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ (دراصل قصور آپ کی عادتوں کا ہے۔ مرچیں اور تمباکو آپ کی غذا کا اہم جزو ہے اور ورزش سے سدا کی نفرت ہے)۔

"گھر کا طبیب"، "خانگی وید"، "گھریلو ڈاکٹر" کی قسم کی کتابیں بڑے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ ان میں سے ایک مہلک سی بیماری منتخب کر کے اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک مبتلا رہتے ہیں، جب تک اس سے بہتر مہلک بیماری نہیں مل جاتی۔

۶۳ء میں دق کے مریض بنے رہے۔ پھر کسی نے بتایا کہ دق کا تو علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ۶۴ء میں اپنے لئے ضعفِ دل تجویز فرمایا۔ ۶۵ء میں خون کے کم دباؤ

کی شکایت رہی۔ ۶۶ء میں خون کے زیادہ دباؤ کی اور ۶۷ء میں نارمل دباؤ کی۔ پھر دو سال تک گُردے کی بیماریاں۔ (ایک ایک کر کے سب)۔

کسی نے طبّی رسالے میں پڑھایا کہ جگر کی رسولی بڑی خطرناک ہوتی ہے لہٰذا ۷۰ء میں جگر کی رسولی۔

اب تک متعدد جان لیوا بیماریوں کے مریض رہ چکے ہیں (اور متعدد ڈاکٹروں میں سے کچھ کو اور زیادہ امیر بنا چکے ہیں اور کچھ کی زندگیاں تباہ کر چکے ہیں)۔

ہاضم دوائیاں ان کا کھانا (مرچ مصالحے) ہضم کرتی ہیں۔ خواب آور دوائیوں سے نیند آتی ہے۔ اسپرین سے پراسرار درد دُور ہوتے ہیں۔ سکون پیدا کرنے والی گولیوں سے زبردستی پیدا کیا ہوا ذہنی انتشار کچھ دیر کے لئے کم ہو جاتا ہے۔ (پتہ نہیں ان کے اپنے اعضاء دن بھر کیا کرتے ہیں)۔

معمولی سے معمولی عارضے کا جب تک بڑا سارا سائنٹیفک نام تلاش نہ کر لیں مطمئن نہیں ہوتے۔ چونکہ صاحبِ دولت ہیں اس لئے انواع و اقسام کے عارضوں میں مبتلا ہونے کی توفیق رکھتے ہیں.

چند سال گزرے کہ رات کو بار بار ایک ہی خواب نظر آتا جس میں ایسے شیر سے ڈر جاتے جس نے کتّے کی کھال پہنی ہوئی ہوتی۔ دوستوں کے مشورے پر ایک ماہرِ نفسیات سے مشورہ کیا جس کا دعویٰ تھا "تین ماہ میں شرطیہ شفا، ورنہ مرض

واپس"۔ تین ماہ کے علاج کے بعد یہ فرق پڑا کہ خواب میں کتّا نظر آنے لگا جس نے شیر کی کھال پہنی ہوئی تھی۔

اب چونکہ طبّی کتابوں میں لکھی ہوئی تقریباً ساری بیماریاں ختم ہو چکی ہے اس لئے انہیں چھوڑ کر اور باتوں کا فکر کرنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی فلاں کیا کہے گا؟ کہیں ایسا نہ ہو جائے؟ ہائے یوں کیوں نہ ہوا؟ اُف! یوں کیوں کر ہو گیا؟

کبھی کوئی کہہ دے کہ آج آپ خوش نظر آرہے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ آج میرا موڈ ٹھیک نہیں۔

پچھلے سال سے ہی فکر لاحق ہے کہ ملک میں ایک زبردست ادبی جمود آیا ہوا ہے۔ اگرچہ آپ کو ادب سے کئی میل دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن اس غم سے چہرے پر جھُریاں پڑ گئی ہیں۔

چہرے کی جھُریوں کا فکر الگ رہتا ہے۔

پدرِم سُلطانی

اس قدر دُبلے پتلے ہیں کہ پہلی مرتبہ نظر نہیں آتے۔ اچھی طرح دیکھنے کے لئے تین چار مرتبہ غور سے دیکھنا پڑتا ہے۔

آپ نے گھر میں جگہ جگہ تلواریں، ڈھالیں، پیشی قبض، پستول اور خنجر سجا رکھے ہیں۔ اور خاندان کے افراد کے کارنامے سُنانا محبوب مشغلہ ہے۔۔۔ "یہ نعل تب کی ہے جب دادا جان کے چچا محاصرۂ چین میں لڑے تھے۔ (غالباً محاصرین

اور محصورین دونوں سے)۔ ان کے گھوڑے نے دشمن سپاہی کے دولتّی رسید کی اور نعل گر پڑی جو انہوں نے اُٹھا کر جیب میں رکھ لی۔"

یا "یہ تلوار جنگِ ہنومان گڑھ میں استعمال ہوتی تھی۔ پڑدادا کے ماموں نے اس سے دُشمن کا ایک گھوڑا ہلاک کیا۔" (دشمن سوار گھوڑے کے نیچے دب گیا ہو گا۔)

اور "اس پستول سے خُسر صاحب کے بھائی نے ایک آدم خور شیر کو مارنا چاہا لیکن شیر کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ اُسے عین وقت پر چھینک آ گئی۔ وہ ذرا سا اُچھلا اور نشانہ خطا ہو گیا۔"

اس کے علاوہ "خود دادا جان نے (بطور ٹھیکیدار) کئی لڑائیوں میں حصّہ لیا جنگِ عظیم کے دوران بصرہ میں لڑے (ٹھیکیداروں سے)۔ ایران میں بڑی جواں مردی سے دشمن (حریف ٹھیکیداروں) کا مقابلہ کیا۔ بڑے بڑے ممتاز افسروں کے ساتھ رہے۔ (سب سے لڑے)۔ یہ اُن کے تمغے ہیں" (جو انہوں نے کسی کباڑیے سے خریدے)۔

کسی قنوطی واقف نے ڈرا دیا کہ اگر چور گھر میں گھُس آئے تو یہی ہتھیار اہلِ خانہ پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اب آپ نے ساری چیزیں اُتار کر ایک کمرے میں بند کر کے مضبوط سا قُفل لگا دیا ہے۔

دوستوں کو پورا یقین ہے کہ آج تک آپ سے کوئی دلیری کا کام سرزد نہیں ہوا۔

اب دو تین سال سے بزرگوں کی دریا دِلی کے قصّے شروع کر دیئے ہیں۔ ”دادا جان کے خُسر ہاتھی پر سیر کو جارہے تھے کسی فقیر نے ہاتھی کی تعریف کر دی۔ آپ نے فوراً ہاتھی اس کے حوالے کیا اور پیدل چلے آئے۔“

یا ”خُسر کے دادا جان ریشمی رضائی اوڑھے کہیں جارہے تھے۔ کسی ضرورت مند نے سوال کیا۔ آپ نے فوراً اُتار کر اسے تھما دی اور بغیر رضائی کے واپس چلے آئے۔“

(بعد میں باہر جانا بند کر دیا ہو گا۔ شاید سال میں دو تین مرتبہ باہر نکلتے ہوں گے، وہ بھی اندھیرے میں)۔

آپ کی زبان بڑی تیز ہے۔ اکثر دانتوں سے زبان کٹ جاتی ہے اور زبان سے دانت گھِس چکے ہیں۔

ذکی الحِس نئی دہلوی

اوائل جوانی میں (لگاتار سگریٹ اور چاء نوشی سے) کافی بیزار رہے پھر آہستہ آہستہ عادت پڑ گئی۔

۶۰ء میں ایک دن اچھے بھلے بیٹھے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہُوا کہ یکایک نقّاد بن گئے۔ تب سے نقّاد ہیں اور کافی ہاؤس یا چاء خانوں میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھار حجامت کے سلسلے میں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

ادبی رسائل کے شروع شروع کے پچیس تیس صفحات آپ کی تنقیدوں کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں۔ (جنہیں ایم-اے اُردُو کے طلباء کو مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے)۔

۶۷ء میں کسی نے کہا کہ اُردُو ادب پر ان کی تنقیدوں کے صفحات تلوائے جائیں اور پھر سارے ادب کا وزن کیا جائے تو تنقیدیں کہیں بھاری نکلیں گی۔ آپ اسے شاباش سمجھ کر بہت خوش ہوئے اور رفتار دُگنی کر دی۔

یہ اُردُو نثر کی نِری خوش قسمتی ہے کہ آپ اسے زیادہ نہیں چھیڑتے۔ آپ کا بیشتر وقت اُردُو شاعری کی خبر لینے میں گزرتا ہے۔

ان دنوں پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں جس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ غالب کی شاعری پر رنگین کا اثر غالب ہے۔ رنگین نے بیشتر موضوع مصحفی سے اخذ کئے۔ مصحفی کی شاعری کا ماخذ میر کا تخیّل ہے جنھوں نے بہت کچھ سراج دکنی سے لیا۔ سراج دکنی نے ولی دکنی سے، اور ولی دکنی نے سب کچھ دکّن سے چُرایا۔ (چونکہ مقالہ رسائل کے لئے نہیں، یونیورسٹی کے لئے ہے، اس لئے آپ نے شعرا کو اتنا بُرا بھلا نہیں کہا جتنا کہ اکثر کہا کرتے ہیں)۔

اگر چاء اور سگریٹوں میں غذائیت ہوتی تو آپ کبھی کے پہلوان بن چکے ہوتے حقیقت یہ ہے کہ آپ کی صحت کو دیکھ کر بڑی آسانی سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

دراصل آپ کے رویّے (اور تنقید) کا دارو مدار سگرٹوں اور چاء کی پیالیوں کی تعداد پر ہے۔ روزانہ پچاس سگرٹوں اور پچیس پیالیوں تک تو آپ شاعری کے گناہ معاف کرسکتے ہیں، لیکن اس کے بعد آزاد شاعری تک کو نہیں بخشتے۔

۶۸ء میں آپ کو یوں ہی وہم سا ہو گیا تھا کہ آپ عوام میں مقبول نہیں ہیں لیکن چھان بین کرنے کے بعد ۶۹ء میں معلوم ہوا کہ وہم بے بنیاد تھا۔ فقط وہ جو انہیں اچھی طرح نہیں جانتے، انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن جو جانتے ہیں وہ باقاعدہ ناپسند کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو (پتہ نہیں کیوں) مظلوم اور ستایا ہوا سمجھتے ہیں اور اکثر زندگی کی محرومیوں کی داستان کافی ہاؤس میں سُنایا کرتے ہیں جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:-

پہلے ان کے خواب تمام ہوئے۔ پھر دانت تمام ہوئے۔ پھر دوست تمام ہوئے۔ (کم از کم آپ کا یہی خیال تھا کہ وہ دوست تھے)۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ آپ کو بنی نوع انسان سے قطعاً نفرت نہیں۔ فقط انسان اچھے نہیں لگتے۔

کھیل کود کو انٹلکچوئل پنے کا دشمن سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ لمبے لمبے سانس لینے سے بھی نفرت ہے۔

۶۹ء میں وزن کرتے وقت مشین سے کارڈ نکلا جس پر وزن پونے انتالیس سیر کے علاوہ یہ لکھا تھا۔ ”ابھی کچھ اُمید باقی ہے۔ غیر صحتمند حرکتیں چھوڑ کر ورزش

کیجئے۔ صحیح غذا اور اچھی صحبت کی عادت ڈالیے اور قدرت کو موقع دیجئے کہ آپ کی مدد کر سکے۔"

آپ نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا حالانکہ اگر کسی مشین نے کبھی سچ بولا ہے تو اس وزن کی مشین نے ۶۹ء میں بولا تھا۔

ریحانہ خانم۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی

سنِ پیدائش ایک راز ہے جو ہمیشہ راز رہے گا۔

کسی زمانے میں آپ چھریری اور سمارٹ تھیں اور اتنی حسین تھی کہ کھانستے ہوئے بھی خوبصورت لگا کرتیں۔

کانونٹ میں تعلیم پائی۔ آپ کا خیال ہے شاید بچپن میں ہیگل کے فلسفے سے متاثر ہوئی تھیں اور لڑکپن میں شوپنہار سے۔ پھر کانٹ، کنفیوشس، شِلر (اور اسی قسم کے دیگر نام جنہیں دوہرانا فیشن میں شامل ہے) نے خیالات پر اثر ڈالا۔

عذرا پاؤنڈ کو (خاتون سمجھ کر) بڑے انہماک سے پڑھا۔ (لیکن جب پتہ چلا کہ یہ تو کوئی مَر دُوا ہے تو فوراً ترک کر دیا۔)

شروع ہی سے انٹلکچوئل بننے کا فیصلہ کر چکی تھیں اس لئے عجیب و غریب مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ مثلاً "اسکیمو قوم کا فوق البشر"، "بدّ ُولوگوں کا فلسفۂ معاشیات"، "کارلائل اور چینی تُرکستان"، "سائبیریا اور مہاتما بُدھ" وغیرہ۔ یہ اور ایسی اور چیزیں کالج یونین میں (شوروغل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے) پڑھیں۔

ان دِنوں عورت اور مرد کے حقوق پر (حسبِ معمول) کافی لے دے ہو رہی تھی۔ آپ بھی اس تحریک میں شریک ہو گئیں۔

ایک تقریر کی جس پر (حلقۂ نسواں میں) واہ واہ ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی مرد اُلٹی سیدھی حرکتیں کرے تو فقط یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مرد کتنا بے وقوف ہے۔ لیکن اگر کسی عورت سے وہی حرکتیں سرزد ہوں تو ساری عورتوں کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے کہ یہ سب کی سب ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔ کتنی بے انصافی ہے؟

آپ نے یہ بھی بتایا کہ مرد ہمیشہ جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ تم سے شادی نہ ہو سکی تو خودکُشی کر لوں گا لیکن ان میں سے اکثر بُزدل زندہ رہتے ہیں۔

۶۴ء میں ایسے کئی لیکچر (اپنی سہیلیوں) کو دیئے۔ دھواں دھار تقریریں (گھر میں) کیں اور (اپنے خیال میں) عورتوں کے حقوق کی سب سے اہم علمبردار بن گئیں۔

۶۶ء میں کسی ریسرچ کے بعد دو تین مقالے لکھے جو ضرور اعلیٰ پائے کے ہوں گے کیونکہ وہ عام فہم نہیں تھے اور ان میں سے ایک پر آپ کو ڈگری ملی تھی۔

آپ کی نظر شروع سے کمزور رہی لیکن عینک سے چِڑ تھی اس لئے بینائی ٹیسٹ کرنے کے چارٹ (جن میں مختلف حروف چھپے ہوتے ہیں) زبانی رَٹ لئے۔

جب عزیز و اقارب عینک لگوانے کا مشورہ دیتے تو آپ آنکھوں کے سپیشلسٹ کے سامنے وہ حروف (بغیر دیکھے) فر فر پڑھ کر سُنا دیتیں۔

پہلے آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ پچیس سال سے پہلے شادی نہیں کریں گی۔ لیکن بعد میں مجبوراً طے کرنا پڑا کہ جب تک شادی نہ ہو سکی، پچیس برس کی رہیں گی۔

اُسی سال آپ نے CAREER WOMEN بننے کا مصمم ارادہ کیا جو بعد میں ترک کرنا پڑا۔ کیونکہ ملک میں بیشتر لوگ کیریر کو وہ چیز سمجھتے ہیں جو سائیکل کے پیچھے لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اس پر آپ کو اتنا غصّہ آیا کہ اندھا دھند شادی کر ڈالی اور خاوند کے بڑے بڑے بچّوں کو بھی گھر بُلا لیا۔

۶۸ء میں آپ کا وزن ایک من بیس سیر تھا۔

۶۹ء میں مشہور مقالہ "چھوٹے بچّوں کا (بروقت) دانت نکالنا" چھپوایا جسے (نئے نئے شادی شدہ) لوگوں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

۷۰ء وزن پونے دو من۔ ایک بصیرت افروز مقالہ "بھُوت پریت سے بچّوں کو محفوظ رکھنا"۔

۷۱ء وزن دو من۔ جامع مضمون "بچّوں سے بھُوت پریت کو محفوظ رکھنا"۔

ان دنوں ریسرچ کر رہی ہیں کہ شرارتی بچّوں کو زدوکوب کر کے سدھارنا بہتر ہے یا مار کُٹائی سے۔

آپ کی خریدی ہوئی آلڈس ہکسلے، سٹیفن سینڈر، جیمز جوائس وغیرہ کی متعدد کتابیں کباڑیوں کے ہاں پہنچ چکی ہیں۔

بی تھوون، موزارٹ، شوپن وغیرہ کے گراموفون ریکارڈ بھی نوکروں نے اِدھر اُدھر کر دیئے۔ اور یہ کلاسیکی مغربی موسیقی پڑوس کے ایک چھوٹے سے ہوٹل پر فلمی گانوں کے ساتھ (انگلش بینڈ سمجھ کر) بجائی جاتی ہے۔

آپ کے خاوند قطب الدّین صاحب بھی آپ کے مکان میں رہتے ہیں۔

شیخ رہبرِ عالم

پرائمری جماعتوں میں تین برس فیل ہوئے اور مِڈل میں چار مرتبہ، میٹرک میں پانچ مرتبہ ناکامیاب رہے۔ جب ایف اے میں چھٹا سال چل رہا تھا تو آپ پڑھائی چھوڑ کر اُس جماعت میں شامل ہو گئے جو اس قسم کے بھولے بھٹکے نوجوانوں کو ذرا سے کام کے عوض وظیفے دیا کرتی تھی۔

چنانچہ پہلے سطح زمین کے اُوپر کام کیا کرتے، پھر زیرِ زمین کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۶۶ء میں (کافی ہاؤس کے) مباحثوں میں سرگرمی سے حصّہ لینا شروع کیا۔

۶۷ء جگہ جگہ (ہوٹلوں میں) جوشیلی تقریریں کیں۔

۶۸ء آخر آپ کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور آپ نے تین چار جگہ فساد کرا دیا اور حالات ناساز گار پاکر زیرِ زمین چلے گئے۔ چھ مہینے کے بعد باہر نکلے۔

۶۹ء پمفلٹ تقسیم کئے (اور وظیفے میں اضافہ ہو گیا)۔

۷۰ء خفیہ پولیس کے افراد سے ملاقات۔

۷۱ء دوست احباب کی نظروں سے اوجھل (یعنی زیرِ زمین رہے)۔

۷۲ء نئے پمفلٹ۔ (اور وظیفے ہیں اور اضافہ)

۷۳ء خفیہ پولیس۔

۷۴ء نِت نئے پمفلٹ۔ (وظیفے میں مزید اضافہ)۔

۷۵ء خفیہ پولیس۔

۷۶ء ایک نہایت تلخ و تُرش (اور ہونّق) مجموعۂ کلام کسی سے لکھوا کر اس امید پر چھپوایا کہ وہ ضبط ہو جائے گا لیکن مایوسی ہوئی کیسی نے کتاب یا مصنّف کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

۷۷ء پولیس (جو خفیہ نہیں تھی۔)

آخر تنگ آ کر ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گئے۔

آپ کے حق میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک آپ نے کبھی باقاعدہ حوالات کی حوّا (یعنی ہوا) نہیں کھائی۔

ش م میر

جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر یقین نہیں کرتے۔ آپ کا بیشتر وقت ایسی باتوں کے متعلق سوچنے میں گزرتا ہے جو غیر معمولی ہوں۔

اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام لگاتار خطوط لکھنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔
کسی اخبار میں کسی شخص کا کیسے ہی موضوع پر خط چھپے آپ فوراً اس کی تردید کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ سورج مغرب میں غروب ہوتا ہے، تو آپ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ بیان غلط ہے۔ سُورج یا تو 'مغرب مغرب جنوب' میں غروب ہوتا ہے یا پھر 'مغرب شمال مغرب' میں۔
۶۷ء میں فرمایا کہ اخباروں کو چاہئے کہ جہاں گنتی کا ذکر آئے وہاں ہندسوں کی بجائے الفاظ استعمال کیا کریں جیسے "۱۱۰ افراد جُوا کھیل رہے تھے" کو جلدی میں پڑھا جائے تو یوں لگے گا جیسے ایک سو دس افراد جُوا کھیل رہے ہیں۔
۶۸ء میں "صحتمند شہریت" کی تردید میں چھپوایا کہ اگر دنیا میں سب لوگ شریف النفس اور پرہیز گار ہو جائیں تو نہ چوریاں ہوں، نہ لڑائی جھگڑے اور حادثے۔ لہٰذا اخبار بالکل چھوٹے سے رہ جائیں، ریڈیو کی خبریں بور کرنے لگیں، سنسنی خیز کہانیاں اور ناول بھی ختم ہو جائیں۔ لہٰذا پبلک کو شرارتی لوگوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ وہ بیہودہ حرکتوں سے زندگی میں تنوّع اور چہل پہل پیدا کرتے ہیں۔ (آپ خود بھی شرارتوں کو پسند فرماتے ہیں)۔
۶۹ء میں "قرض کی برائیوں" کے پمفلٹ پر تنقید کی کہ ہم سب اخباروں میں اکثر پڑھتے رہتے ہیں کہ آج نیوزی لینڈ نے آسٹریلیا سے پانچ کروڑ پاؤنڈ قرض لیا ہے یا انگلستان کو کینیڈا نے دس کروڑ ڈالر اُدھار دیئے ہیں لیکن کسی اخبار میں ان

قرضوں کی ادائیگی کا ذکر کبھی نہیں ہوتا کہ آج فرانس نے اٹلی کا قرض چُکا دیا، یا ہالینڈ نے اپنا حساب برابر کر دیا ہو۔ جب بڑے بڑے ملک یوں ساری دنیا کے سامنے مقروض رہ سکتے ہیں تو ہم تُم کسی شُمار میں ہیں۔(دراصل آپ ہمیشہ مقروض رہتے ہیں۔)

۷۰ء میں اخبار میں آپ کا خط چھپا کہ انسان میں کچھ خامیاں اور بُری عادتیں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اُنہیں ترک کر کے وہ تسکین اور مسرّت حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر خوبیاں ہی خوبیاں ہوں تو پھر کیا ترک کیا جا سکتا ہے اور تسکین یا مسرّت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔(یہ بیان بھی حسبِ حال تھا۔)

۷۱ء میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر مایوسی کا اظہار کیا کہ انسانی جسم میں اکثر اعضاء غلط فِٹ کئے گئے ہیں۔ مثلاً پیٹ جیسا ملائم حصّہ (جس پر ضرب لگانے کو خوامخواہ جی چاہتا ہے) سامنے ہر گز نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اسی طرح گھُٹنے اور پنڈلی کے حصّے ضرورت سے زیادہ سخت ہیں اور بار بار میز، کرسیوں سے ٹکراتے ہیں۔ کان اور دُم کے پٹّھے اب تک جسمِ انسانی کا حصّہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کبھی کان کو اور دُم کو ہلانے کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے۔ (اور امّید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ کبھی بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔)

اور یہ کہ ہم اپنے آپ کو چوپایوں سے محض اس لئے بہتر سمجھتے ہیں کہ کسی طرح اگلی دو ٹانگیں اُٹھا کر سیدھے کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور ان اگلی

ٹانگوں کو اپنے بازو سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی بیچارے گھوڑے اس طرح کھڑے ہونے کی (ہارس شو میں) کوشش کیا کرتے ہیں لیکن اب تک ناکام رہے ہیں۔ جس دن انہیں کامیابی ہوئی، ہمارا یہ اشرف المخلوقات والا ریکٹ ختم ہو جائے گا۔

۷۲ء میں مقالہ چھپوایا کہ تاریخی شہر پاٹلی پتر ادراصل پنجابی نام ہے۔ اس لئے یا تو یہ شہر پنجاب میں آباد تھا، یا پنجاب مشرقی ہندوستان کے اس شہر تک پھیلا ہوا ہو گا۔ لگتا یہی ہے کہ اسے پاٹلی صاحب کے پُترا (یعنی بیٹے) نے آباد کیا ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ پاٹلی صاحب پارسی ہوں۔۔۔ جیسے پاٹلی والا۔

۷۳ء میں اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ سارے مذہب محض ایشیا ہی کی پیداوار کیوں ہیں۔ آج تک افریقہ، آسٹریلیا اور امریکہ میں کبھی کوئی پیغمبر پیدا نہیں ہوا۔

۷۴ء آپ نے انقلابِ فرانس کی اصل وجہ دریافت کی اور بتایا کہ لوئی شانزدھم کے عہد میں لوگ لوئیوں کی تعداد سے بالکل تنگ آچکے تھے۔ چار پانچ یا سات آٹھ لوئی ہوتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن اکٹھے سولہ لوئی، یہ سراسر زیادتی تھی۔ اگر فرانسیسی انقلاب کر کے فوراً انسداد نہ کرتے تو اب تک کم از کم ڈیڑھ سو لوئی ہوتا۔

۷۵ء میں انکشاف کیا کہ مشرقِ وسطےٰ یعنی MIDDLE EAST) کا نام صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ جو قومیں مغرب میں بستی ہیں وہ اس خطّے کو مشرقِ وسطےٰ کہہ سکتی ہیں لیکن جہاں ہم رہتے ہیں وہاں سے ہمارے لئے یہ مغرب وسطےٰ MIDDLE WESTہونا چاہیے۔

۶۷ء میں بیان دیا کہ جس طرح PALM یعنی ہتھیلی سے پامسٹری نے جنم لیا، اسی طرح اس کے COUNTER PART تلوے یعنی (SOLE) سے سولسٹری نہ جانے کیوں نہ شروع کی جا سکی۔ کیونکہ پاؤں کا تلوا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی کہ ہتھیلی۔ یقیناً اس پر بھی کئی معنی خیز لائنیں موجود ہوں گی۔ قسمت کی بڑی لکیروں کے علاوہ چھوٹی لکیریں۔ پاؤں پسارنے، پاؤں گِن گِن رکھنے، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے، پاؤں پھیلانے، دبے پاؤں آنے، پاؤں کے چکّر وغیرہ کے بارے میں بھی مل سکیں گی۔ آپ نے پُرزور سفارش کی کہ اس سلسلے میں فوراً کام شروع ہو جانا چاہئے۔

۷۷ء میں اس بات پر افسوس کیا کہ انگریز اس علاقے میں اتنے طویل عرصے تک رہے۔ ہم نے انگریزی سیکھ لی لیکن انہوں نے اُردُو کو بالکل نظر انداز کیا۔

میر صاحب نے کئی برس پرانا چشم دید واقعہ رقم کیا کہ جب پہاڑ پور کے نواب صاحب گدّی نشین ہوئے تو جہاں ساری رعایا اور تقریب پر باہر سے آئے ہوئے معزّز مہمان "نواب صاحب پہاڑ پور زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے

وہاں ریاست میں متعیّن انگریز ریذیڈنٹ سب کے ساتھ مل کر بڑی سنجیدگی سے "نواب صاحب پہاڑپور IN THE BAG" چلّا رہا تھا۔

۱۹۷۸ء میں خرّاٹوں کے متعلق یہ بتایا کہ خرّاٹے دراصل اُس زمانہ ماقبل تاریخ کی یادگار ہیں جب انسان غاروں میں رہا کرتا۔ غاروں میں نہ کواڑ ہوتے نہ قُفل۔ رات کو شکار کی تلاش میں نکلے ہوئے خونخوار درندوں کو بھگانے کے لئے اسے رات کو سوتے یا جاگتے ہوئے مجبوراً نہایت بھیانک آوازیں نکالنی پڑتی تھیں۔ یہ عادت نسلاً بعد نسلاً جاری رہی۔ اور پھر پختہ ہو گئی۔

اب حالات کہیں بہتر ہو چکے ہیں لیکن جاگتے وقت تو نہیں، لیکن سوتے وقت وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو آباواجداد کیا کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ پبلک آپ کا نوٹس لینے لگی ہے۔ (یہ اور بات ہے کہ آپ کاغذ کا بزنس کرتے ہیں، اس قسم کی شہرت سے آپ کو کچھ کاروباری فائدہ ضرور پہنچتا ہو گا)۔

شیام سُندر سجن (اصلی نام قاضی قلندر بخش)

دس برس تک ایکسٹرا رہے پانچ سال وِلّن۔ اِن دِنوں اسسٹنٹ ہیرو ہیں۔

چونکہ آپ اداکاری کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں اس لئے ابھی تک ہیرو نہیں بن سکے۔ لیکن ہمارے ہاں ہیرو اور ہیروئن بننے کے

لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ پینتالیس برس کی ہیروئن اور پچاس سال کے ہیرو اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ لہٰذا ابھی مایوس نہیں ہوئے۔

۶۶ء میں جب اصلی ہیرو قُمار خانے میں غُل غپاڑے (غل زیادہ، غپاڑا کم) کرتے ہوئے پکڑا گیا تو آپ کو ہیرو بننے کے لئے کہا گیا۔ ہیرو کی مونچھیں لمبی لمبی ہونی چاہیے تھیں کیونکہ فلم تاریخی تھی۔ چنانچہ آپ نے چند ہفتے کی چھٹی مانگی تاکہ مونچھیں مطلوبہ سائز کی ہو جائیں۔ (آپ کو مونچھیں پیش بھی کی گئیں مگر آپ کو نقلی چیزوں سے نفرت ہے۔)

ڈائریکٹر نے کہا کہ اتنی دیر میں تو اصلی ہیرو حراست سے واپس آ جائے گا۔

۶۷ء میں جب ہیرو دھوکہ بازی اور چوری کے قدموں میں ملوث ہوا تو آپ کو دوبارہ چانس دیا گیا۔ ہیرو کے بال لمبے ہوا کرتے ہیں اور قلمیں کافی نیچی۔ آپ نے نقلی بال لگانے سے انکار کر دیا اور پھر کچھ ہفتوں کی مہلت مانگی۔ اُدھر پروڈیوسر صاحب ایک مشہور گانے والی سے سارے پلے بیک گانے ریکارڈ کرا چکے تھے۔ (اگرچہ فلم کی کہانی ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی) اُنہیں پبلک کو نئی دُھنیں دینے کی جلدی تھی۔ لہٰذا وہ آپ کا انتظار نہ کر سکے اور پارٹ ایک اور ایکٹر کو ملا جس کی مونچھیں نوکدار تھیں۔ سر کے بال کندھوں تک آئے تھے اور چہرے پر وہ اظہار تھا جو کھوئی ہوئی گائے کے مُنہ پر ہوتا ہے۔

آپ رول میں جان ڈال دیتے ہیں۔ پارٹ کرتے وقت بالکل بھُول جاتے ہیں کہ کیمرے کے سامنے ہیں اور ایکٹنگ کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ لڑائی کے سین میں جوش آ گیا اور ایک ایکٹر کے سر پر (لکڑی کی چمکیلی) تلوار دے ماری۔ بعد میں کئی مرتبہ معافی مانگی تو معاملہ رفع دفع ہوا۔

"جلوہ ترا تاروں میں ہے اور شمس و قمر میں" کا گانا گاتے ہوئے تاروں اور شمس پر آسمان کی طرف اشارہ کیا اور قمری پر بڑی بے ساختگی سے اپنی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہلایا۔

پھر ایک دفعہ چور کا پارٹ کرتے ہوئے ایک بہت اُونچی دیوار سے خواہ مخواہ چھلانگ لگا دی اور گھٹنا توڑ لیا۔ کئی ہفتے ہسپتال میں گُزرے۔

غمناک سین آئے تو گلسرین کے آنسو ٹپکانے کی بجائے خوب بھُوں بھُوں کر کے روتے ہیں۔

رول ادا کرتے وقت جو تاریخی اور درباری لباس سٹوڈیو میں پہنا تھا اسے تبدیل کئے بغیر میک اپ سمیت گھر چلے جاتے ہیں۔ راستے میں تماشائی اور بعض اوقات پولیس کے سپاہی پیچھے لگ جاتے ہیں۔

چونکہ حسّاس ہیں، اس لئے جس ایکٹریس کے ساتھ پارٹ کرتے ہی اس پر عاشق ہو کر فوراً! خود کُشی کی کوشش کرتے ہیں۔

۷۲ء میں جب چوتھی مرتبہ ہسپتال میں داخل ہوئے تو ڈاکٹروں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسی طرح خودکُشی کی مزید کوششیں کی گئیں تو آپ کی صحت بالکل تباہ ہو جائے گی۔

شروع سے آپ کو یہی شکایت ہے کہ یہاں آرٹ کی قدر نہیں ہوتی۔

صحیح رقم خوش نویس

پہلے کچھ اور کیا کرتے تھے۔ ایک دن جھنجھلا کر کاتب بن گئے۔

آپ کی لکھی ہوئی عبارت پر پروئے ہوئے موتیوں کا گماں ہوتا ہے۔

زبان کے پکّے ہیں۔ جب وعدہ کر لیتے ہیں تو اُسی سال کام مکمل کر کے رہتے ہیں۔

لکھتے وقت موقع (اور اپنے موڈ) کے مطابق عبارت میں ترمیم کرتے جاتے ہیں۔ عالمِ دلسوزی کی عالمِ ڈلہوزی، بچھڑا عاشق کو بچھڑا اعاشق، سہروردی کو سر دردی، سماجی بہبودگی کو سماجی بیہودگی، وادئ نیل کو دادئ بیل بنا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

کسی غلام حسن کے نواسے نے اپنے آپ کو نبیرۂ غلام حسن لکھا، جو آپ کو نامانوس سا معلوم ہُوا۔ چنانچہ آپ نے کچھ دیر سوچ کر اسے بٹیرۂ غلام حسن تحریر فرمایا۔

ایک رومانی افسانے میں حُور شمائل ناز نین کو چور شمائل ناز نین لکھ کر کہانی کو چار چاند لگا دیئے۔ اسی طرح قہقہے کو قمقمے، موٹے موٹے انجیروں کو موٹے موٹے انجنیئروں، اپنا حصّہ کو اپنا حقّہ، پھُلواری کو پٹواری بنا دیتے ہیں۔

پروازِ تخیّل کی انتہا ہے کہ جہاں شبلی عفی عنہ لکھنا چاہیے تھا وہاں لکھا، ستلی کئی عدد۔

اس وقت ملک میں آپ سے بہتر کاتب ملنا محال ہے۔

مسٹر منظور فضل ایم۔ اے

آپ بے حد پریکٹیکل انسان ہیں۔

پہلے میٹرک کیا۔ چونکہ میٹرک کر چکے تھے اس لئے بی۔ اے کرنا پڑا اور پھر ایم اے۔

ایم اے پاس کر چکے تھے، اس لئے ملازمت کرنی پڑی۔

چونکہ ملازم ہو گئے تھے اس لئے شادی بھی ضروری تھی۔ پہلے کسی حسینہ سے محبت کرنے کا خیال آیا۔ پھر سوچا کہ محبّت میں بار بار یہ بیان دینا پڑتا ہے کہ پہلی دفعہ گھائل ہُوا ہوں اور زندگی بھر کسی اور پر عاشق نہیں ہوں گا۔ اور جو کہیں محبوب سے شادی ہو جائے تو عُمر بھر لگاتار محبّت جتانی پڑتی ہے، جھوٹی قسمیں کھانی پڑتی ہیں۔

لہٰذا آپ نے سادہ شکل کی لڑکی سے نارمل شادی کو پسند فرمایا۔ اس فارمولے کے ماتحت کہ خوبصورتی دیرپا نہیں ہوتی، جلد ہی مُرجھا جاتی ہے۔ لیکن سادہ شکل کی یہ خوبی ہے کہ ہمیشہ سادہ شکل رہتی ہے۔

جب آپ نے یہ نوٹ کیا کہ دفتر میں کام ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ کہ آج کا کام پرسوں، پرلے روز یا اس سے بعد بھی کیا جاسکتا ہے تو کبھی کبھی چُپ چاپ تین چار روز کے لئے کھِسک جاتے۔ سپرنٹنڈنٹ اور ہیڈ کلرک وغیرہ کو ہمراز بنا کر سردی کے موسم میں دستانے، مفلر، اوورکوٹ، بریف کیس چاء کی پیالیاں، ایک کھلی ہوئی فائل اور اس پڑھنے کی عینک اپنے دفتر میں چھوڑ جاتے۔ اور گرمیوں میں سیاہ عینک، تھرماس، چھتری، بریف کیس، شربت کا آدھا پیا ہوا گلاس، کھلی ہوئی فائل اور اس پر قلم یا پنسل۔

آپ کے متعلق کوئی پوچھتا تو جواب ملتا کہ ابھی یہیں تھے کسی دوسرے دفتر گئے ہیں۔ اور اگر کوئی ملنے آ جاتا تو ان کی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے ایسے ہی فقرے دہرائے جاتے۔

اور جب آپ دفتر میں ہوتے تو کسی ملاقاتی کی آمد کا اشارہ پاتے ہی (باہر سے چپڑاسی کھانس دیا کرتا) بریف کیس پکڑ کر دروازے میں اس سے علیک سلیک کرتے۔ اگر ملاقات مقصود ہوتی تو کہتے "خوب وقت پر پہنچے۔ ابھی ابھی ایک

کانفرنس سے آرہا ہوں"۔ اور اگر نہ ملنا ہوتا تو پھر "معاف کرنا، مجھے ابھی ابھی ایک کانفرنس میں پہنچنا ہے۔"

۶۷ء میں آپ پچیس برس کے تھے۔ کاغذ پنسل لے کر حساب لگایا کہ اگر اگلے تین برس میں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے باپ بن گئے تو ۸۷ء تک (جب آپ پچپن برس کے ہو کر ملازمت سے ریٹائر ہوں گے۔) لڑکی کی شادی ہو چکی ہو گی اور دونوں لڑکے تعلیم سے فارغ ہونے والے ہوں گے۔

۷۰ء تک کوئی اولاد نہ ہوئی تو آپ کو دوبارہ حساب لگا کر دوبارہ شادی کرنی پڑی۔

۷۷ء میں یہ پوزیشن تھی:

دوسری بیوی سے۔۔۔۔ چار بچّے

پہلی بیوی سے۔۔۔۔ چھ بچّے

میزان۔۔۔۔۔ دس لڑکیاں

بڑے چوکس، چوکنّے اور چُست انسان ہیں۔ خیالات سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر وقت مائل بہ عمل رہتے ہیں۔ جب تک خود نہ دیکھ لیں کسی چیز پر یقین نہیں کرتے۔ چونکہ خداوند تعالےٰ کو نہیں دیکھ سکتے اس لئے کبھی کبھی کچھ دہریے سے بن جاتے ہیں۔ کچھ حساب لگا کر ایمان لے آتے ہیں۔

ہر کام کو فارمولوں کے مطابق کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پچاس مہمانوں کی دعوت کرنی ہو تو پہلے کہیں سے اسّی آدمی اکٹھے کر کے گھر اِدھر اُدھر بٹھا کر ریہرسل کرتے ہیں، جو اکثر ناکامیاب رہتی ہے چنانچہ کسی کو مدعو نہیں کرتے۔

"دستر خوان نہ بچھانے میں ایک عیب۔ بچھانے میں سو عیب" پر عمل کرتے ہوئے پانچ چھ برس کے بعد جب دعوت کرتے ہیں تو روپیہ گوند کی طرح بہاتے ہیں ورنہ عموماً سوشل بننے کے لئے جب کبھی دوسروں سے رابطہ قائم کرتے ہیں تو اس طرح کہ "اگر آپ ڈِنر کے لئے وقت نکال سکیں اور ہم دونوں اکٹھے ہو سکیں تو مجھے خوشی ہو گی۔ اور فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔"

۲۷ء میں یکلخت سگریٹ چھوڑ دیئے کیونکہ آپ نے حساب لگا کر معلوم کیا کہ جو شخص دن میں بیس سگریٹ پیتا ہے وہ مہینے میں تقریباً چالیس گز یعنی ساڑھے پانچ مہینوں میں ایک فرلانگ سگرٹیں پی جاتا ہے۔

۴۷ء میں اپنے چھوٹے بھائیوں حبیب اور منیر کے نام اس لئے بدلوا دیئے کہ آپ کے خیال میں لوگ جلدی میں حبیب کو جیب اور منیر کو میز پڑھ جاتے ہیں۔

آپ کو طرح طرح کے شوق رہ چکے ہیں۔ چند سال شاعری بھی کی۔ مجموعۂ کلام مرتّب کیا۔ اگلے سال غور سے پڑھا تو یونہی سا معلوم ہوا۔ فوراً مسودہ تلف کر دیا۔ (کاش کہ دیگر حضرات بھی اسی طرح کیا کریں۔)

پھر چند دوستوں نے شکار کا شوق دلایا۔ چند ماہ کی مشقّت کے بعد آپ نے حساب لگایا کہ اکٹھے کارتوس خریدے جائیں تو ایک کارتوس تقریباً دس آنے کا پڑتا ہے اور عام شکاریوں کے نشانے کے مطابق ایک تیتر یا بٹیر پر کم از کم پانچ چھ فائر کرنے پڑتے ہیں۔ (اور گرتے گرتے ان میں سے کچھ پرندے جھاڑیوں میں کھوئے بھی جاتے ہیں۔)

یعنی ایک مختصر سا پرندہ اتنے کا نہیں پڑتا جس قدر اُس پر صرف کیا جاتا ہے۔ اتنی ہی قیمت سے ایک بڑا مرغ یا دو چوزے با آسانی خریدے جا سکتے ہیں۔ نہ پندرہ بیس میل پیدل چلنا پڑتا ہے اور نہ شکار کے سلسلے میں لاف زنی کرتے ہوئے جھُوٹ مُوٹ کے قصّے گھڑنے پڑتے ہیں۔

اگلے سال کسی عزیز نے پولیس میں بھرتی ہونے کی اتنی تعریفیں کیں کہ پہلے آپ نے چاند ماری کی مشق شروع کر دی۔ (اگر چاند نکلا ہوا ہوتا تو اسے ضرور گولی لگ جاتی، کیونکہ گولیاں دائیں بائیں ہر سمت میں جا رہی تھیں)۔ کسی سے پولیس کی وردی مانگ کر پہنی۔ آئینے کے سامنے کچھ دیر کھڑے رہے اور ارادہ بدل دیا۔

کہیں پڑھا کہ ٹھیکیداری میں بڑا نفع ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ٹھیکیداری بھی شروع کر دی۔

۷۶ء میں اِدھر اُدھر سے چیز بہم پہنچا کر رفاہِ عامہ کے لئے ایک مسجد تعمیر کر رہے تھے کہ کسی نے شکایت کر دی کہ محض سرکاری خرچ پر بہشت جانا چاہتا ہے۔
۷۷ء میں مقدمہ چلا۔ آپ صاف بری ہو گئے۔ (کیونکہ آپ نے جو وکیل چُنا تھا وہ بے حد ہوشیار تھا۔)
۷۸ء میں اہلِ قلم بننے کا فیصلہ کیا لیکن بعد میں اپنے قلم کا اور اپنا بغور معائنہ کر کے خیال ترک کر دیا۔
آپ کا قول ہے کہ دنیا میں ترقّی کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو اپنی محنت اور قابلیت سے اور دوئم اوروں کی بے وقوفی اور سُستی سے۔
آپ دوسرے طریق پر عمل فرماتے ہیں۔

منظّم ایچ خاں

۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۵۳ء میں پہلی مرتبہ جوان ہوئے۔
جوان ہوتے ہی علم و ادب پر جان چھڑکنے لگے۔ ۵۷ء تک جان چھڑکتے رہے۔
۵۸ء میں علم و ادب آگے نکل گیا۔
۵۹ء میں جان چھڑکنا منسوخ کر دیا۔
۶۰ء میں با قاعدہ جوان ہوئے اور تنظیم میں حصّہ لینے لگے۔
۶۱ء انجمن تحفّظِ گُوجراں کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور اگلے سال حلقۂ تربیتِ پہلواناں کے خزانچی۔

۶۳ء کبڈی لیگ کے ایڈیشنل نائب صدر۔

۶۴ء جماعت پرورشِ مویشیاں کے سب اسسٹنٹ سیکرٹری۔

زندگی کا مقصد۔۔۔ کارڈ چھپوا کر تقسیم کرنا۔ ہر تین چار ہفتے کے بعد کوئی نہ کوئی جلسہ منعقد کرانا۔ پچھلے جلسے کی روئیداد پڑھنا۔ تقریروں کے دوران میں اور اختتام پر تالیاں بجانا۔

مہر نگار زرّیں

اصلی نام مجیدہ سبحان علی ہے۔

۶۶ء میں ڈاکٹری پاس کی اور پریکٹس شروع کر دی۔

۶۷ء میں محلّے والے وفد کی صورت میں آئے اور التماس کیا کہ طبابت ہی ایسا فن ہے جس سے انسانیت کی سب سے زیادہ خدمت کی جا سکتی ہے اور معاوضہ لینے سے وہ بات نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے مریضوں کو مُفت دیکھنا شروع کر دیا۔

۶۷ء میں کئی لیڈی ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ جب وکیل اور انجنیئر مُفت کام نہیں کرتے تو معاوضہ لینے میں کیا ہرج ہے۔ لہٰذا آپ نے فیس لینی شروع کر دی۔

۶۸ء محلّے کے کچھ لوگوں کی درخواست پر فیس چھوڑ دی۔

۷۰ء کچھ اور لوگوں کے کہنے پر فیس شروع کر دی۔

نیز انہی کے اصرار پر شادی کا ارادہ کیا اور خاوند کی تلاش شروع ہوئی جو کافی مشکل تھی۔ اچھے خاوند ملنے محال تھے کیونکہ اُن کی بیویاں اُن پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔

۷۰ء ہی میں ایک صاحب جو بے حد حسّاس اور رومان پسند معلوم ہوتے تھے، آپ کے پیچھے لگ گئے۔ جب آپ سے ملے تو باتیں کرتے کرتے شدّتِ جذبات سے چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ گلے کی رگیں پھُول جاتیں، آنکھیں دُھندلی ہو جاتیں اور سانس رُک جاتا۔

آپ اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان سے شادی کر لی۔

۷۱ء میں معلوم ہوا کہ وہ صاحب دراصل دمے کے مرض تھے۔ شدّتِ جذبات کی علامات در حقیقت دمے کی نشانیاں تھیں۔

آپ پہلے عینک لگاتی تھیں لیکن شادی کے بعد اُتار دی۔ (پہلی وجہ یہ تھی کہ عینک کے بغیر آپ کا چہرہ قدرے بہتر لگتا تھا۔ دوسری یہ کہ عینک کے بغیر خاوند کا چہرہ دھندلا۔۔۔ لہٰذا ذرا بہتر معلوم ہوتا تھا۔)

۷۵ء میں چار بچّے تھے۔ سُسرال والوں کے اصرار پر پریکٹس چھوڑنی پڑی۔ مگر محلّے والوں نے اصرار کیا کہ اتنی مشکلوں سے سیکھا ہوا فن ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ڈاکٹری شروع کر دی۔

۷۶ء خاوند کے رشتہ داروں نے دوبارہ احتجاج کیا کہ بچّوں کی نگہداشت اور تربیت سوائے ماں کے کوئی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹری چھوڑنی پڑی۔

۷۷ء پریکٹس شروع کر دی۔

۷۸ء پریکٹس چھوڑ دی۔

۷۹ء ڈاکٹری شروع تو کی لیکن اس طرح کہ مریضوں کو دیکھتے وقت اپنے بچّوں کا دھیان رہتا۔ بچّوں کی دیکھ بھال کے دوران مریض ذہن میں رہتے۔ اور یہ کیفیت تھی کہ کئی مریضوں کو بچّوں کی طرح ڈانٹ دیا کہ فوراً ہاتھ مُنہ دھو کر آؤ، یا اپنے جوتے بدلو، قمیض صاف نہیں، شرارتیں مت کرو، وغیرہ۔ اُدھر کبھی کبھی ساتویں بچّوں کو نسخے پکڑا دیتیں، اور بے خبری میں اُن سے فیس بھی مانگ لیتیں۔

آپ کا کہنا ہے کہ آپ موٹی ہر گز نہیں ہیں۔ وزن اور قد کے جو چارٹ بنے ہوئے ہیں، اُن کے مطابق فقط آپ کا قد ذرا لمبا ہونا چاہیے تھا۔ آپ کو اس بات پر بھی خوشی ہے کہ پچھلے پانچ سال سے آپ کا وزن بالکل ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ (یعنی تین مَن پُختہ۔)

بچّوں کے کپڑے سُتھرے اور اُجلے رکھنے کا بہترین طریقہ آپ نے یہ بتایا کہ ایسے کپڑوں کو بچّوں سے دُور رکھنا چاہیے۔

مستری رحمت بخش

غالباً ۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ (اگر ۳۷ یا ۳۹ یا ۴۰ء میں پیدا ہوتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا)۔

سُنا ہے کہ بچپن میں ہر بات میں بلا کی تندی و تیزی دکھاتے تھے۔ بزرگ سر ہلا ہلا کر کہتے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور کچھ کرے گا۔ جوان ہو کر موٹر ڈرائیور بنے۔ ان دِنوں بَس ڈرائیور ہیں۔

آپ نے برسوں کے تجربے سے موٹر چلانے کے چند سنہرے اصول وضع کئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:-

1۔ موٹر ہمیشہ سڑک کے بیچ میں چلاؤ کیونکہ سائیکل والے اور پیدل حضرات جان بوجھ کر سڑک کا درمیانہ حصّہ استعمال کرتے ہیں۔

2۔ کسی موٹر کو آگے مت نکلنے دو۔ اگر کوئی ہارن بجا جا کر تنگ کرنے لگے تو ذرا دائیں طرف ہو کر راستے کی دھول اس پر ڈالو۔ خود ہی پیچھے ہو جائے گا۔

3۔ اگر کوئی موٹر آگے جا رہی ہو تو اسے اپنی ذاتی توہین سمجھو، اور فوراً آگے نکل جاؤ، خواہ راستہ ہو یا نہ ہو۔

4۔ موڑتے وقت گاڑی کی رفتار کم از کم پچاس میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے، ورنہ موشن ٹوٹ جائے گا اور ناحق گیئر بدلنا پڑے گا۔

5۔ گیئر بدلنے اور بریک لگانے سے ہمیشہ احتراز کرو۔ اس طرح مشینری گھِسنے سے بچ جائے گی۔

6۔ رات کو سامنے سے گاڑی آ رہی ہو تو اللہ کا نام لے کر اس پر پوری روشنی چھوڑ دو۔ یہ دوسرے ڈرائیور کا فرض ہے کہ اپنی موٹر کسی طرح بچائے۔

7۔ یاد رکھو کہ ہر حادثے میں بَس ڈرائیور دیسی فلموں کے ہیرو کی طرح صاف بچ جاتا ہے۔ چنانچہ حادثے سے پہلے دروازے سے کُود جانے کے لئے تیار رہو۔ (ہر ہفتے اس کی ریہرسل کر لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں ہے)۔

8۔ رات کو حادثہ کرتے ہی موٹر کی بتّیاں بجھا کر پوری رفتار سے بھاگ نکلوا تاکہ کسی کو گاڑی کا نمبر نہ معلوم ہو سکے۔

دن کے وقت اپنی تیز رفتاری اور لاپرواہی سے حادثہ کرنے لگو اور متعلقہ راہگیر یا سائیکل یا موٹر والا اپنی ذہانت اور چُستی سے کسی طرح بچ جائے تو معصومیت سے کسی اور سمت میں دیکھنے لگو۔ کسی نامعلوم چیز کو۔

9۔ موٹر میں ہارن اس لئے لگایا گیا ہے کہ اسے لگاتار استعمال کیا جائے۔ اگر سڑک پر چڑیا بھی ہو تو ہارن بجا دو۔ مسافر اور راہگیر دونوں متاثر ہوں گے۔

جہاں ”یہاں ہارن بجانا منع ہے“ کا نادر شاہی حکم نصب ہو تو وہاں انتقاماً شور مچاؤ۔ کچھ دنوں تک بورڈ خود ہٹ جائے گا۔

10۔ موٹر چلاتے وقت یا موڑتے ہوئے، ہاتھ یا روشنی سے اشارے کرنا بیکار ہے۔ معلوم کرنا کہ موٹر کس طرف مُڑے گی، یا اب کیا کرے گی، دوسروں کا فرض ہے۔ کوئی ڈرائیور اپنا داہنا بازو باہر نکالے تو اس سے کوئی خاص مطلب اخذ مت کرو۔ شاید وہ اپنا تھکا ہوا بازو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ یا دائیں طرف مُڑنا چاہتا ہے۔ یا بائیں سمت مُڑے گا۔ یا کسی جانب بھی نہیں مُڑے گا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کسی دوست کو دیکھ کر ہیلو کر رہا ہو۔ یا شاید موٹر روکنا چاہتا ہو وغیرہ وغیرہ۔

11۔ پھاٹکوں پر IN اور OUT لوگ خوبصورتی کے لئے لگا دیتے ہیں۔۔۔ جیسے کہ ”خوش آمدید“ لکھا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو پھاٹک پہلے آئے اس میں بلا تکلّف گھُس جاؤ۔

12۔ اپنی لاری کو خوب سجاؤ۔ طرح طرح کے رنگین ڈیزائنوں والے نفیس طغرے اور مرزوں مصرعے۔۔۔ مثلاً ”آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں“، ”پھر ملیں گے اگر خدا لایا“، ”لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے“۔۔۔ ہوں تو سواریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

۷۰ء میں آپ کا سکور یہ تھا:

چار بیل، ایک سائیکل، (سائیکل سوار فرار ہو گیا)، تین السیشن کتّے، پانچ راہگیر (معمولی ضربات)، ایک پُل کا کچھ حصّہ۔

۷۱ء دو بیل گاڑیاں (مع بیلوں کے اور غالباً سوئے ہوئے گاڑی بانوں کے)، ایک موٹر سائیکل (سوار شدید مضروب ہوا)، ایک نئی کار (جس کا مالک سامنے کے دفتر کی طرف کار کا بیمہ کرانے جارہا تھا)، ریل کا پھاٹک (جو بند تھا)، چوراہے میں کھڑے ہوئے سپاہی کی سیاہ عینک اور موئی چھڑی (اُس نے آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی)۔

آپ کو فخر ہے کہ ہر سال آپ کا سکور پچھلے سال سے بہتر ہوتا ہے۔

ویسے چند مرتبہ آپ کا چالان بھی ہوا، لیکن دیگر بس اور ٹرک ڈرائیوروں کی طرح بچنے میں کامیاب ہو گئے۔

آپ نے موٹر چلانے کے جو اصول وضع کئے تھے ان پر ملک بھر میں عمل کیا جاتا ہے۔

منشی اعجاز حسن محتسب

صدی کے شروع میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر اور پھر جوانی میں بڑا انتظار رہا کہ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش آتا۔ پھر بوڑھے ہو گئے۔

نہایت شریف النفس ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو ہمیشہ نظریں نیچی کر کے چلتے ہیں۔ لوگوں سے اکثر ٹکرا جاتے۔ کئی مرتبہ تانگوں موٹروں کے نیچے آتے آتے بچے۔

بڑے صاف گو ہیں۔ کوئی ملنے جائے تو وعلیکم السّلام کے بعد پوچھتے ہیں کہ کیا کام ہے؟

ایک مرتبہ ایک ترقّی پسند شعر سُن کر بولے "لا حول ولا قوۃ الا بلا۔۔ مگر بھئی سبحان اللہ۔"

اکثر نوجوانوں کو نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔

جو حرکتیں جوانی میں خود کرنا چاہتے تھے، اگر کسی نو عمر کو کرتے دیکھ پائیں تو خفا ہو جاتے ہیں اور اُسے بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔

وضعداری کے پابند ہیں۔ کوئی بُلائے تو دیر سے پہنچتے ہیں۔ اکثر آتے ہی نہیں۔ (بہت سے لوگ تقریبوں میں انہیں اس اُمید پر بھی مدعو کر لیتے ہیں کہ شاید یہ آئیں ہی نہ)

آپ کو فخر ہے کہ دنیا بھر میں آپ کا ایک بھی دشمن نہیں ہے۔ (غالباً اتنے طویل عرصے میں وہ سب انتقال کر چکے ہوں گے)۔

نزہت جمیل

آپ امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے بخوبی وقت ضائع کر سکتے ہیں۔ ۶۴ء سے آپ نے کرکٹ کا کھلاڑی بننے کے لئے بہتیرے جتن کئے اور کافی روپیہ صرف کیا، لیکن کامیابی نہ ہوتی۔

آپ کا اصلی نام میاں ملنگ باز تھا لیکن جب آپ نے نوٹ کیا کہ ان دِنوں کھلاڑی نفیس شاہد، احسن صبیح، رفعت نفیس، نجیف لطیف، طلعت ملیح کی قسم کے نام رکھنے لگے ہیں تو آپ نے بھی اپنا نام بدل لیا۔

۶۷ء میں آپ نے وکٹ کیپر بن کر شہرت حاصل کرنی چاہی۔ (چونکہ آپ میں اسپورٹسمین بننے کی صلاحیتیں بالکل نہیں تھیں اس لئے کرکٹ کو آپ کی ذات سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکا)۔

جب بیٹسمین بولر کی گیند پر بلّا گھماتا لیکن گیند اور بلّے کی ملاقات نہ ہو سکتی تو آپ گیند کو کیچ کرتے وقت مُنہ سے پٹاخ کی آواز نکالتے اور ساتھ ہی امپائر سے اپیل کرتے۔ کبھی کبھی امپائر کو شُبہ ہو جاتا کہ پٹاخ کی وہ آواز بلّے سے گیند چھُو جانے کی تھی اور وہ بے قصور بیٹسمین کو آؤٹ قرار دے دیتا۔ کچھ عرصے کے بعد لوگوں کو پتہ چل گیا اور آپ کی وکٹ کیپری سے سب بدگمان ہو گئے۔

اگلے سال بولر بننے کی کوشش کی۔

آپ نے سر کے بال بڑھا لئے اور میچ کی صبح کو ویزلین، تیل یا کوئی اور چِکنی چیز سر میں مَل لیتے۔ گیند پھینک کر سر پر ہاتھ پھیرتے اور جب گیند واپس ملتی تو چکنے ہاتھوں سے اُسے چمکاتے رہتے۔ چنانچہ جتنی دیر آپ بولنگ کرتے گیند کی چمک دمک جوں کی توں رہتی۔ لیکن لوگوں کو اس کا بھی پتہ چل گیا۔ ساتھ ہی آپ نے ایک نیا تجربہ شروع کیا۔ کبھی کبھی گیند پھینکتے وقت امپائر کی آواز میں زور سے NO BALL چلّا دیتے۔ بیٹسمین ایسی گیند کو لاپرواہی سے کھیلتا اور اگر آؤٹ ہو جاتا تو خوب جھگڑا ہوتا۔ امپائر قسمیں کھاتا کہ میں نے 'نو بال' نہیں کہا۔ ضد کرتے کہ امپائر کے سوا ایسا فیصلہ کون دے سکتا ہے۔

۷۰ء میں بیٹسمین بننے کا فیصلہ کیا۔

مخالف ٹیم کو تنگ کرنے کے لئے ہر OVER کی چند گیندیں رائٹ ہینڈر بن کر کھیلتے اور چند لیفٹ ہینڈر بن کر۔ چنانچہ آپ کے لئے بار بار فیلڈ بدلی جاتی۔ اس طرح کافی وقت ضائع ہوتا اور مخالفت ٹیم سے زیادہ تماشائی خفا ہوتے۔

۷۲ء میں باقاعدہ پریس کانفرنس طلب کی اور بیان دیا کہ آپ کو دیگر اہم مصروفیات کی وجہ سے فرسٹ کلاس کرکٹ (ففتھ یا سیونتھ کلاس کرکٹ کہنا چاہیے تھا) سے ریٹائر ہونا پڑ رہا ہے۔ (اس پر کرکٹ نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا)۔

۱۹۷۳ء کے بعد سے یہ مشغلہ ہے کہ جہاں کہیں کرکٹ کا میچ ہو رہا ہو، وہاں ضرور جاتے ہیں اور دونوں ٹیموں کے کھیلنے والوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

نسیم اے ڈی (اللہ ڈِوایا نسیم)

آپ کا نام عمر دراز، جِندوڈا، یا کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جنہیں مل کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ آج نہ ملتے تو کل یا پرسوں مل جاتے۔ خاندانی امیر ہیں۔ پیری مُریدی کا سلسلہ بھی ہے۔ لہٰذا ہر قسم کے فکر (بلکہ قیدِ زمان و مکاں) سے آزاد ہیں۔

ملک کے بیشتر ممتاز کالجوں کو یہ فخر ہے کہ آپ اُن کے اولڈ بوائے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ڈگری لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اس لئے نہ کبھی لیکچر سُنے اور نہ کبھی امتحان دیا۔) آپ کے بارے میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

صحت ماشاء اللہ ایسی ہے کہ وٹامنز ان سے کچھ مدد لینا چاہیں تو لے لیں لیکن انہیں وٹامن کی قطعاً ضرورت نہیں۔

آپ کو ہر قسم کے تجربے سے نفرت ہے۔ اکثر طنزاً کہا کرتے ہیں کہ کئی آدمیوں کے پاس تجربے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

کبھی سیر و سیاحت کا ذکر ہو تو فرماتے ہیں کہ اہرامِ مصر، روم کا کلوزیم، دیوارِ چین، سپین کا الحمراء، امریکہ کا عظیم CANYON وغیرہ میرے بغیر بھی خیریت سے ہیں۔ بھلا وہاں جا کر میں ان کے لئے کیا کر دوں گا؟

چونکہ خوش خوراک ہیں اس لئے خوش مزاج ہیں۔ ہر وہ ناخوشگوار واقعہ کسی اور کو پیش آئے، انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

چوبیس گھنٹوں میں سے پندرہ سولہ منٹ سو کر گزارتے ہیں۔ اور اتنے زور سے خرّاٹے لیتے ہیں کہ خود بار بار جاگ اُٹھتے ہیں۔

ان کی شادیوں کی وجہ محبّت بیان کی جاتی ہے۔۔۔ انہیں دوست سے ہمیشہ محبّت رہی ہے۔ آپ کی زندگی ہمّت اور تحمّل کا مرقّع رہی ہے۔ ہر آزمائش اور سختی کا مقابلہ آپ نے غصّے اور گالیوں سے کیا ہے۔

۶۵۵ میں بٹیر بازی کا شوق تھا۔۔۔ ۵۷ء میں کبوتروں کا۔

۵۸ء میں مُرغ لڑانے کے فن سے رغبت ہوئی۔

۵۹ء شکاری و دیگر قیمتی کتّے۔

۶۰ء گھوڑوں میں دلچسپی لینے لگے۔

(گھُڑدوڑ میں۔ سواری میں نہیں)

۶۱ء میدانِ سیاست میں قدم رکھا۔

۶۲ء قدم واپس اُٹھالیا۔

لیکن جب اگلے سال آپ کا ایک واقف میونسپلٹی کا صدر منتخب ہوا تو طیش میں آ کر رزم گاہِ سیاست میں کُود پڑے۔ تب سے اب تک کھانے، سونے اور مشغلوں سے جو مختصر سا وقت بچتا ہو گا اُسے ملک کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔

ہر وقت زندگی کی بے شمار مصروفیتوں اور عدیم الفرصتی کی شکایت کرتے ہیں۔

جلسوں میں اکثر ان متعدد قربانیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آپ نے (پتہ نہیں کب) قوم کے لئے دی تھیں۔ (غالباً بقر عید پر دی ہوں گی)۔

ڈھوک پیر بخش میں رہتے تھے۔ وہی ہیں۔ اور وہیں رہیں گے۔

دو مزاح نگار

ضمیر جعفری

مقبول شاعر، نثر نگار، کالم نویس اور بذلہ سنج ضمیر جعفری کو کون نہیں جانتا؟ شاید وہ معدودے چند نہ جانتے ہوں جو جان بوجھ کر کسی کو بھی جانا نہیں چاہتے۔
ضمیر ان خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جنہیں اُردُو کی شاندار روایات کے مطابق مشہور ہونے میں کم از کم ایک سو یا ڈیڑھ سو برس نہیں لگے، بلکہ اُنہوں نے محض تیس پینتیس سال کے "قلیل عرصے" میں ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ (یہ اور بات ہے کہ مغربی ممالک میں کامیاب مصنّف یہ مرحلہ مہینوں میں طے کر لیتے ہیں)۔
کبھی ملازمت میں مشغول، کبھی فری لانسر، ضمیر پی این سی۔ اسلام آباد کے ڈی ڈی سی بننے سے پہلے سی ڈی اے کے ڈی پی آر تھے۔ جہاں انہیں ٹی کیو اے بھی ملا تھا۔
(مندرجہ بالا تین سطروں کو حل آپ خود کر لیجئے۔)

اس سے پہلے آپ فوج میں میجر رہے۔ اور اس سے قبل روزنامہ "بادِ شمال" کے نامہ نویس، مدیر، مالک ۔۔۔ یعنی سب کچھ۔

"بادِ شمال" سے پہلے مشرقِ بعید (جسے FAR-EAST کہا جاتا تھا اور بعض اوقات اب بھی کہا جاتا ہے، تعلقاتِ عامّہ (اور کبھی کبھی تعلقاتِ خاصہ) کے سلسلے میں قیام رہا۔ سنگاپور میں جناب چراغ حسن حسرت کی رفاقت میسّر تھی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران اچھے خاصے دِن دیکھے۔ (ویسے اِن دِنوں بھی وقت کچھ بُرا نہیں گُزر رہا)۔

اس سے پہلے یعنی سمندر پار جانے کی تیاری میں، لاہور کے صحافی گوشوں میں خوب کوچہ گردی کی۔ چنانچہ صحافت سے کچھ ایسی CONFRONTATION رہی کہ دونوں فریق مستفیض ہوئے۔

اور اس سے ذرا پہلے اسلامیہ کالج لاہور کے اولڈ بوائے بننے میں مصروف رہے۔ کالج کے رسالے کریسنٹ کو ایڈٹ کیا کرتے۔

۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ گریجویٹ کہلائے۔ ساتھ ہی آپ کا کلام ممتاز رسائل میں چھپنے لگا۔ اور لاہور کی مشہور ادبی شخصیّتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بی اے بننے کے لئے ایف اے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا کیمبل پور سے ایف اے کی سند لینی پڑی تھی۔ وہاں بھی کالج میگزین کی ادارت نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ (یا ضمیر نے میگزین کا پیچھا نہیں چھوڑا)۔

اور ایف اے کے لئے دسویں جماعت جہلم سے پاس کی گئی۔ وہاں آپ نے پہلی مرتبہ شعر کہنے شروع کئے اور سکول کے ملک الشعراء تصوّر کئے جانے لگے۔
چونکہ میٹرک کیا تھا اس لئے مڈل کلاس میں بھی پاس ہوئے ہوں گے، جس کے لئے لازمی طور پر پرائمری جماعتوں میں پڑھے ہوں گے۔
اس سے پہلے یقیناً آپ چھوٹے سے بچّے ہوں گے اور موجودہ عُمر یعنی ساٹھ اور کچھ سال ناٹ آوٗٹ (جس میں ایک بھی لیگ بائی یا آف بائی شامل نہیں) سنہ اُنیس سو کُچھ کے کسی مہینے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔
پیدائش سے پہلے البتہ آپ گمنام تھے۔
ضمیر جیسے منجھے ہوئے ادبی VETERAN کو طرح طرح کے تجربے ہوئے ہیں جو اب تک جاری ہیں۔
یوں تو تنقید برائے تنقید کے سلسلے میں نقّاد یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ضمیر کو فنونِ لطیفہ کی جانب کچھ زیادہ رغبت دکھانی چاہیئے تھی۔ یعنی وہ کم از کم ''تجریدی آرٹ'' ہی سیکھ لیتے۔ اور کچھ نہیں تو انشایئے (جو کچھ بھی وہ ہوتے ہی) لکھنے کی کوشش کرتے، فنِ موسیقی کی جستجو میں انہیں وائلن یا طبلہ بجانا چاہیے تھا۔
انسانیت کی نبض شناسی کے لئے انہوں نے حکمت کا پیشہ کیوں نہیں اختیار کیا؟ قدرت کی عظمت، رفعت، وسعت وغیرہ سے آشنا ہونے کے واسطے وہ اُونچے پہاڑوں کی مشہور چوٹیاں سر کرنے والی مہموں کے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ خوشنما

نظاروں سے تکبّر اور فیضان حاصل کرنے کے لئے انہوں نے محکمۂ جنگلات میں ملازمت کیوں نہیں کی اور یہ کہ اب تک ایم اے (اُردُو) کا امتحان تک نہیں دیا۔ بلکہ اور تو اور، ابھی تک شاہین خضاب کبھی نہیں لگایا۔ اُنہیں اس شعر کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی: ؎

دشمنِ زندگی است موئے سفید

روئے دشمن سیاہ سیاہ باید کرد

وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

راقم الحروف ایسی باتوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

آپ جہلم کے کوہستانِ نمک سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے نظم، نثر، گفتگو میں دلآویز نمکینی ہے۔

آپ کے بزرگ نامی گرامی مُرشد تھے۔ تبھی فقر و غناء اور ؎

اپنے ہی ہاتھ سے دید جو مجھے دینا ہے

میری تشہیر نہ فرما مجھے سائل نہ بنا

کی دولت ملی ہے۔

شروع شروع کی شاعری سنجیدہ تھی لیکن قسمت۔۔۔ اور ضمیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ اب یہ حال ہے کہ تحریر ہو، یا تقریر، یا کچھ بھی نہ ہو۔۔۔ ہر وقت طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔

لیکن جب کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو ایک کونے میں جا کر چپکے سے سنجیدہ شاعری بھی کر بیٹھتے ہیں۔ صحت مندی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ اسپورٹسمین رہ چکے ہیں۔

اور کھلاڑیوں کا مقولہ مشہور ہے کہ:-

ONCE A SPORTS MAN ALWAYS A SPORTS ”
“MAN

جوانی کا ایک شعر ہے:

تیرے کوچے میں یوں کھڑا ہوں میں

جیسے ہاکی کا گول کیپر ہوں

یعنی جہاں اپنے نظر انداز کئے جانے کا سرسری طور پر گلہ کیا ہے وہاں اپنی اہمیت بھی جتادی ہے کہ گول کیپر چاہے تو اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ ٹیم کو ہرا سکتا ہے۔

کئی برس ہوئے راولپنڈی میں ویسٹ انڈیز اور مقامی ٹیم کا میچ ہو رہا تھا۔ اس میں فاسٹ، بلکہ بے حد فاسٹ بولر HALL کے تابڑ توڑ حملوں کا فی البدیہہ ذکر سٹیڈیم میں بیٹھ کر یوں کیا:

شور اُٹھا کہ ہال آتا ہے کھیل کا انتقال آتا ہے

ہال سے پہلے بال آتی ہے۔ بال سے پہلے "حال" آتا ہے

یا تو یہ اشعار ہال نے سُن لئے (اور سمجھ لئے) یا ہماری ٹیم نے۔ ضمیر کا اندازہ درست نکلا۔ اگلے ہی ہفتے ہال نے لاہور کے ٹسٹ میچ میں یکے بعد دیگرے تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے نہ صرف ہیٹ ٹرک کیا بلکہ کھیل کا مکمل طور پر انتقال بھی کر دیا۔

ضمیر کی شاعری کیسی ہے؟ نثر کی کیا خصوصیات ہیں؟ صحافتی تحریروں کا درجہ کیا ہے؟

خوبیاں بیان کرنے لگوں (جو کرنا چاہتا ہوں) تو فطری انکساری کی وجہ سے شاید اسے ضمیر پسند نہ کریں۔ اور اگر اُلٹی سیدھی تنقید کرنے کی کوشش کروں (جو بالکل نہیں چاہتا) تو پڑھنے والوں کو اچھی نہیں لگے گی۔

لہٰذا باکسنگ کے ریفری کی طرح یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس CORNER میں ضمیر ہیں اور دوسرے کارنر میں ان کا۔۔۔ اور SECONDS (یعنی دیگر حضرات) اِدھر اُدھر ہو جائیں۔۔۔اب قاری جانے اور ضمیر۔

ضمیر کے مجموعوں میں جو کچھ پہلے اور آخری صفحے کے درمیان ہے وہ مقبول ہے اور جو بین السطور ہے وہ اور بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔

ابنِ انشاء

(یہ مضمون ۱۹۷۳ء میں لکھا گیا تھا)

ابنِ انشاء کی کتاب ہو، رسالے میں مضمون ہو یا اخبار میں کالم۔۔۔ ان کا نام پڑھتے ہی ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے کہ اب یہ ہنسائیں گے۔ پھر وہ ہنساتے ہیں اور خوب ہنساتے ہیں۔

شہرۂ آفاق مزاح نگار سٹیفن لیکاک (جو پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر بھی تھے) کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے ایک مدّاح کو، جو اِن کے سارے مزاحیہ مجموعے حفظ کر چکا تھا اور ان کی نئی کتاب کی تلاش میں تھا۔ اتفاق سے ان کی اپنے پروفیسرانہ سنجیدہ موضوع پر لکھی ہوئی تصنیف مل گئی۔ وہ بڑھتا جاتا اور قہقہے لگاتا۔ ابھی نصف ختم کی ہو گی کہ کسی نے خبردار کیا کہ نہ صرف یہ لی کاک کی مزاحیہ چیز نہیں بلکہ ایک نہایت خشک موضوع پر ایسی کتاب ہے جو دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

بالکل ایسی ہی توقعات ابنِ انشاء کے مدّاحوں کی ہیں۔
یعنی اگر اتفاق سے کبھی اُنہوں نے ٹھوس، جامع اور سنجیدہ قسم کی تحریریں لکھیں تب بھی مدّاحوں کا رویّہ وہی رہے گا جو کہ ہے۔
ابنِ انشاء اُردُو کے ممتاز آل راؤنڈرز میں سے ہیں جو ضرورت پڑنے پر وکٹ کیپنگ بھی کر لیتے ہیں۔ (ان کی عمدہ شاعری اس کی ضامن ہے۔)
پڑھنے والوں سے ان کا براہِ راست رابطہ رہا ہے۔ انہیں کسی کے توسط سے مقبولیت نہیں ملی، بلکہ انہوں نے اِسے قلم کے زور سے حاصل کیا ہے۔
اپنے اُوپر ہنس سکنا ذہنی صحت مندی کی پہلی نشانی ہے۔ اس سلسلے میں وہ شروع ہی سے بشاش رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ٹیلیفون پر باتیں کرتے ہوئے بھی اُن کی مسکراہٹ سُنی جا سکتی ہے۔
اُنہوں نے اپنی تحریروں کے شروع یا آخر میں یہ کبھی نہیں لکھا کہ اِن میں سارے واقعات، مقامات اور کردار فرضی میں اور اِن کا کسی زندہ یا مُردہ شخص۔۔۔ یا نیم زندہ یا نیم مُردہ (ان دنوں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں) سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔
ایسے فقرے بار بار پڑھ کر پبلک کو اب اس عبارت پر کچھ اتنا اعتبار نہیں رہا بلکہ اُلٹا شبہ سا ہونے لگتا ہے کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہوا ہو گا تبھی معذرت کی جا رہی ہے۔

وہ ان گنے گنائے مصنفین میں سے ہیں جنہیں پڑھتے وقت مطالعے کی رفتار خود بخود آہستہ ہو جاتی ہے تاکہ کتاب جلد ختم نہ ہو۔

اپنے سفر ناموں میں وہ محض فوٹو گرافی ہی نہیں کرتے۔ تاثرات اور تخیّل سے مصوّری بھی کرتے ہیں۔

ماہرین نے اصلی یعنی GENUINE سیّاحوں کے لئے یہ چند قدریں مقرر کی ہیں:

- دوسرے ملکوں سے واپس وطن پہنچتے ہی اگلے سفر کا انتظار اور چاؤ اور

زائرانِ حَرم و دَیر کبھُو

میرے حق میں بھی دُعا کیجئے گا۔۔۔ کا ورد

- ایک اور نیا سفر شروع ہونے پر طمانیت کہ ع زہے روانی عُمرے کہ در سفر گزرد
- دورانِ سفر چوکس اور چوکنّے رہنا۔

اے حسینو نہ راستہ روکو

ہم فقیروں کو دُور جانا ہے

- اور سفر ختم ہونے پر افسوس اور گھر لَوٹنے سے ٹال مٹول۔۔۔ اور

داغِ وارفتہ کو ہم آج ترے کُوچے سے

اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے۔۔۔ کس طرح کی واپسی۔
ابنِ انشاء کی سیّاحی نہ صرف ان شرطوں پر پوری اترتی ہے بلکہ وہ کچھ اور آگے نکل چکے ہیں۔ اور اب اُنہوں نے

ع سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

کانوٹس لینا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ بقول انگریزوں کے وہ سفر کرتے وقت "خود اپنی STEAM پر ہوتے ہیں۔"
اپنی شاعری میں اُنہوں نے سنگدل محبوب سے عاشقِ خستہ کی مخدوش حالت پر رحم کے لئے اپیل نہیں کی۔ رُومان کی بین الاقوامی تاریخ شاہد ہے کہ اگر کچھ ہونا ہو تو شروع شروع ہی میں ہو جاتا ہے ورنہ اگر پہلے چند OVERS میں وکٹ نہ ملے تو معاملہ طویل اور بورنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ بیشتر معشوق تو چِڑ کر اور بھی زیادہ بے رحمی سے سلوک کرتے ہیں۔
اور اُنہوں نے عاشق سے بعد از مرگ کچھ نہیں کہلوایا۔ سب جانتے ہیں کہ کوئی مرحوم اپنے احساسات کی ترجمانی نہیں کر سکتا اور نہ پریس کے لئے بیان دے سکتا ہے۔ بہرحال اگر کوئی یوں کرتا ہے تو کچھ اس کا مکمل طور پر انتقال نہیں ہوا۔

اسی طرح اُنہوں نے موسمِ بہار کا ذکر کیا ہو تو کیا ہو، لیکن عشّاق پر جنونی کیفیت طاری ہونے کا حوالہ نہیں دیا۔ لڑکوں کے پتھّروں اور کوچۂ یار میں رسوائی کی کبھی شکایت کی۔

شاید اس لئے کہ اوّل تو ان دنوں اعلیٰ درجے کا معیاری عاشق ملنا مشکل ہے، پھر یہ کہ ہر کوئی عاشق ہو جائے تو بہار کے علاوہ سردی، گرمی، مون سُون، خزاں وغیرہ، یعنی دیگر موسموں میں بھی تھوڑا بہت دیوانہ ضرور رہتا ہے۔ ع

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

رہ گیا کوچۂ یار تو اس میں ان دنوں ایسے ایسے عجیب کیریکٹر ملتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں عاشق کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔ باقی یہ کہ پتھّر مارنے کا شغل۔۔۔ تو لڑکے آج کل عاشق کی بجائے دیگر مفید اور کار آمد چیزوں پر پتھّر پھینکتے ہیں۔

نہ انہوں نے ظالم تقدیر، بیکار تدبیر، عُمرِ بے ثبات کے سلسلے میں کوئی خاص احتجاج کیا۔ کیونکہ سارے چرند پرند، درند کی عمروں کا اوسط نکالا جائے تو انسان کے ساٹھ پینسٹھ سال کچھ اتنے بُرے بھی نہیں۔۔۔ خصوصاً جبکہ ''سٹھیا جانے'' کو باقاعدہ طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ رہ گئی تقدیر اور تدبیر۔۔۔ سو ؎

پیش آنی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے

اور اُنہوں نے گُل و بُلبُل، شمع و پروانہ، ابر اور باراں، شبنم، ناقہ لیلٰے اور مجنوں کوہکن وغیرہ وغیرہ پر بھی زیادہ زور نہیں دیا۔

غالباً اس لئے کہ بُلبُل ملک کے ہر حصّے میں نہیں پائی جاتی (بلکہ بیشتر لوگوں نے تو بُلبُل دیکھی ہی نہیں) گُل فقط وہاں ملتے ہیں جہاں اُنہیں حفاظت سے اُگایا جائے۔ پروانے روشنی کے گرد گھُومتے ضرور ہیں لیکن ایک خاص موسم میں ابرو باراں پر ابھی تک انسان کا کنٹرول نہیں ہوا۔ شبنم فقط علی الصبح اُٹھنے والوں کو نظر آتی ہے، وہ بھی کبھی کبھی۔

رہ گئے کوہکن، مجنوں، لیلٰے معہ ناقہ و جرس کے۔۔۔ پبلک بخوبی جانتی ہے کہ مشرق وسطےٰ میں پٹرول نکلنے اور دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ یہ سب ہستیاں OUT ہو چکی ہیں۔

ابنِ انشاء کی شاعری بھی اتنی ہی دلکش ہے جتنی کہ ان کی نثر نویسی اور یہ خوبی کمیاب ہے۔

تحریریں جو وی آنا (آسٹریا) سے شائع ہونے والے بین الاقوامی مجموعوں میں شامل کی گئیں

غار کا بُت

بچپن میں گرمیوں کی تعطیلات کا سال بھر انتظار رہتا۔ سکول تین مہینے کے لئے بند ہوتا تو والدین کے پاس جانے کا موقع ملتا۔

والد صاحب وسط ہند کے علاقے میں تعینات تھے۔ چنانچہ پنجاب سے کئی سو میل کا سفر طے کر کے میں والدین کے پاس پہنچتا۔ سی پی کا وہ علاقہ نہایت خوشنما تھا۔ جگہ جگہ شور مچاتی ہوئی ندیاں، پھلدار درخت، طرح طرح کے پھُولوں والے پردے اور چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی۔

رنگ برنگے پرندوں، قسم قسم کے جانوروں اور جھینگروں کے شور سے جنگل ہر وقت گونجتے رہتے۔ ان گھرے جنگلوں میں نہایت اُونچے اُونچے درخت تھے۔ ان کے نیچے چھوٹے درخت، پھر نیچے جھاڑیاں اور ان سب پر گھنی بیلیں چڑھی ہوئیں۔۔۔۔ اس طرح کہ وہاں سے گزرنا محال تھا۔

رِم جھِم رِم جھِم بارش ہوتی تو کئی کئی روز نہ تھمتی۔ ہوا کا ہر جھونکا اپنے ساتھ ایک نئی خوشبو لاتا اور رات کو اتنے جگنو چمکتے کہ لالٹین کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن جہاں اتنی خوبصورتی تھی وہاں خطرہ بھی تھا۔ ہری بھری پھُولدار جھاڑیوں میں

زہریلے کیڑے مکوڑے تھے۔ اونچی قدِ آدم گھاس میں سانپ، بچھو، کنکھجورے اور درختوں پر بڑی بڑی زہریلی مکڑیاں۔

گھنے جنگل میں جتنے سائے متحرک ہوتے اُن میں شیروں، چیتوں اور ہاتھیوں کی پرچھائیں بھی ہوتیں۔ اکثر سُننے میں آتا کہ صبح صبح جو ڈاک کا ہرکارہ ندی کے پُل پر ملا تھا، دوپہر کو اسے تیندوے نے مار ڈالا۔ یا یہ کہ مکھیاجی (نمبردار) کسی معاملے کی تشخیص کے لئے جا رہے تھے کہ درندے نے انہیں زخمی کر دیا۔ سانپ تو تقریباً ہر جگہ تھے۔۔۔ گھاس میں، پانی میں، صاف سُتھرے میدان میں، پگڈنڈی پر، مکان میں، یہاں تک کہ بعض اوقات جب تیز ہوا چلتی تو کسی درخت سے سانپ گرتا۔

میں چھوٹا تھا۔ اس لئے میرا خاص خیال رکھا جاتا۔ باہر نکلتا تو گھٹنے تک اُونچے ربڑ کے جوتے پہنا کر کسی کے ہمراہ بھیجتے۔ مغرب کے بعد گھر سے جانے کی ممانعت تھی۔

زیادہ وقت ننھی بہن کے ساتھ گھر کے باغیچے میں گزرتا۔ ہم دن بھر تتلیاں پکڑتے، گلدستے بناتے، پھل توڑتے۔ نہ سکول کی حاضری تھی، نہ اُستادوں کا ڈر۔ چھٹیاں تیزی سے گزر جاتیں۔ پھر والدین سے سال بھر کے لئے جدا ہو کر طویل سفر طے کرنا پڑتا۔

محکمہ انہار میں ہونے کی وجہ سے والد صاحب کو قصبوں، شہروں سے دُور جنگلوں، کیمپوں میں رہنا پڑتا۔ لیکن انہیں ایسی زندگی پسند تھی۔ ورزش، فوٹو گرافی اور خطرناک جانوروں کا شکار ان کے محبوب مشغلے تھے اور کھلی ہوئی جگہیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اپنی بڑی ساری موٹر سائیکل پر وہ گھوڑے کی سواری کو ترجیح دیتے۔ محکمہ جنگلات کے افسروں اور اپنے انجنیئر ساتھیوں کے ساتھ وہ اکثر درندوں کے شکار کو جاتے اور کبھی کبھی شیروں، چیتوں کی کھالیں دوستوں کوئی بھیجی جاتیں۔

بعض اوقات جب وہ رات کے دو یا تین بجے واپس آتے تو ہم منتظر ہوتے کہ ضرور یہ کس خطرناک واقعے کا ذکر کریں گے لیکن وہ خاموش رہتے۔

ہم حیوانوں کے متعلق پوچھتے تو وہ ہمیشہ ایک فقرے سے ٹال دیتے ”جب تک انسان جانوروں کو تنگ نہ کرے وہ خود پہل نہیں کرتے۔ اور یہ کہ ہتھیار صرف آدم خور درندوں پر استعمال کرنے چاہئیں۔“

مقامی باشندے دُبلے پتلے اور امن پسند تھے۔ ہر جگہ غربت تھی لیکن چوری کی واردات بہت کم ہوتیں۔ شام کو تھکے ہارے لوگ روشنی کر کے گاتے ناچتے تو سماں بندھ جاتا۔

شاید ان کے بھولپن نے انہیں بے حد وہمی بنا دیا تھا۔ وہ بھُوتوں، چڑیلوں، ارواحِ خبیثہ اور کالے جادو پر پورا اعتقاد رکھتے تھے اور ان سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا

جنگلی درندوں سے، جو ہر وقت اُن کے گرد منڈلاتے رہتے۔ وباؤں، بیماریوں، اور حادثوں کو وہ دیوی دیوتاؤں کی خفگی سے منسوب کرتے اور باقاعدہ علاج کرانے کی بجائے مورتیوں کے سامنے چڑھاوے پیش کرتے۔

ہمارے گھوڑے کا سائیں سُناتا کہ ایک دن کسی نوجوان نے شمشان میں کوڑا کرکٹ ڈال دیا۔ وہ بمشکل وہاں سے باہر نکلا ہو گا کہ کسی اَن دیکھی ہستی نے اسے بھسم کر کے رکھ دیا۔

چپر اسی بتاتا کہ ایک عورت نے دیوی کے سامنے درخواست کرتے ہوئے منّت مانگی لیکن مُراد بَر آنے پر اُسے اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ دیوی نے سب کے سامنے اُسے مفلوج کر دیا۔

منشی جی بتاتے کہ وہ اتفاق سے یونہی مذاق مذاق میں کسی دیوتا کی شان میں گستاخانہ جملے کہہ بیٹھے۔ اُسی رات جب وہ دوسرے گاؤں جارہے تھے تو اُن کے پیچھے بلائیں لگ گئیں۔ خوش قسمتی سے اُن کے ہاتھ میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے مشعل تھی۔ چونکہ بھُوت پریت بھی آگ سے ڈرتے ہیں اس لئے بلائیں اُنہیں ضرر نہ پہنچا سکیں۔ اُنہوں نے ہمّت کر کے کَن انکھیوں سے جھانکا۔۔۔ تین کالی کلوٹی بھیانک شبیہیں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ اور یہ تعاقب دیر تک جاری رہا۔

ایک جگہ مشعل بجھنے لگی تھی لیکن انہوں نے جلدی سے ایک موٹی سی ٹہنی مشعل سے جلالی۔ آخر صبح کا اُجالا پھیلا تو بلائیں غائب ہوئیں۔

اس پر انہوں نے توبہ کی کہ آئندہ ایسی گستاخی کبھی نہیں کریں گے۔

اس قسم کی کہانیاں سُن سُن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کا چپّہ چپّہ آسیب زدہ ہے اور بھُوت پریت انسانوں پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ جو کچھ بھی کہا جائے یا کیا جائے وہ فوراً اُن تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر میں خاموش رہتا۔ کیا ہوا جو ایک بار والد صاحب سے کچھ پوچھ لیا لیکن انہیں خوف وہراس سے نفرت تھی اور پھر سائنس کی تعلیم نے انہیں واہمے اور قیاس آرائیوں سے دُور کر دیا تھا۔

اُن کا سمجھانے کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ نہ وہ کسی خاص سبق پر زور ڈالتے، نہ طویل لیکچر دیتے۔ بس باتوں باتوں میں ریاضی اور سائنس کی مفید باتیں ذہن نشین کرا دیتے۔

شیشے کے گلاس کو نصف پانی سے بھر کر اس میں پنسل ڈبوئی۔ پنسل ٹوٹی ہوئی دکھائی دینے لگی تو بتایا۔ ”آنکھوں کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ اکثر صحیح ہوتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں۔“

سلیٹ پر دو لمبی متوازی لکیریں کھینچ کر اُن پر ترچھے رُخ میں چھوٹی چھوٹی لائنیں ڈالیں تو وہ لمبی لکیر بھی ترچھی معلوم ہونے لگیں۔

"یہ نظر کا دھوکہ ہے۔" وہ بتاتے۔ اور جب چھوٹی ترچھی لائنیں مٹا دیتے تو لمبی سطریں دوبارہ متوازی ہو جاتیں۔ پھر درمیانی لمبی اُنگلی شہادت کی انگلی پر کھینچ کر ان دونوں کے بیچ میں کنکری رکھ دیتے۔ بالکل یوں لگتا جیسے ایک کی بجائے دو کنکریاں چھُو رہا ہوں۔

"کنکری ایک ہے لیکن ان دونوں اُنگلیوں کی نسیں مختلف ہیں۔" وہ سمجھاتے۔

دُور ندی کے کنارے دھوبی کپڑے دھوتا۔ پہلے کپڑا پتھر پر لگتا ہوا نظر آتا، اس کے بعد دھماکا بعد میں سنائی دیتا۔

"قصور نہ آنکھوں کا ہے نہ کانوں کا۔ روشنی کی رفتار اور آواز کی رفتار میں فرق ہے۔ تبھی مغالطہ ہوتا ہے۔ بڑے ہو گے تو ایسی ایسی بے شمار باتیں سائنس کی کتابوں میں پڑھو گے۔"

ایک روز انہوں نے تھرمامیٹر دکھایا۔ نارمل ڈگری کی طرف اشارہ کر کے اسے ذراسا گرم کیا تو پارہ ایک سو پانچ تک جا پہنچا۔

"اب اسے کسی بالکل تندرست آدمی کے مُنہ میں ایک منٹ رکھ کر اُسے ایک سو پانچ ڈگری دکھا دو۔ ذرا سی دیر میں وہ ہاتھ پاؤں میں اینٹھن سی محسوس کرنے لگے گا۔ پھر ماتھا گرم ہو گا اور پھر سچ مچ بخار چڑھ جائے گا۔ لیکن یہ بخار خوف سے چڑھے گا۔ خوف انسان کا دشمن ہے جو اس کے سوچنے، محسوس کرنے، دیکھنے۔۔۔ ہر حِس پر اس طرح مسلّط ہو جاتا ہے کہ مجموعی سمجھ بوجھ میں توازن

نہیں رہتا۔ لہٰذا خلافِ معمول واقعات پر ڈرنے یا پریشان ہونے کی بجائے انہیں اطمینان سے جانچ کر سائنٹیفک حل تلاش کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر غیر معمولی بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوا کرتی ہے۔"

جب میں سائیس، چپڑاسی اور منشی جی کی سُنائی ہوئی کہانیوں کا ذکر کرتا تو وہ بتاتے کہ اس علاقے میں جو اموات بھُوتوں یا دیوتاؤں سے منسوب کی جاتی ہے ان میں سے بیشتر ایسی بیماریوں سے ہوتی ہیں جنہیں مقامی لوگ نہ پہچانتے ہیں نہ ان کا علاج کراتے ہیں۔ گرمیوں میں اکثر سُننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص کو نہ جانے کیا دکھائی دے گیا کہ وہ لمحوں میں ختم ہو گیا۔۔۔ دراصل ایسی موت یہاں سَن سٹروک سے ہوتی ہے۔ یہ سیدھے سادے اَن پڑھ لوگ چیچک جیسی مہلک چیز کو دیوی سمجھ کر پُوجتے ہیں اور خوشامداً اسے ماتا کہتے ہیں۔

سکول بند ہونے میں چند ہفتے باقی تھے کہ والد صاحب کا خط ملا جس میں اُن کے تبادلے کی خبر تھی۔ نئی جگہ پہلے کیمپ سے دُور تھی۔ خط میں ٹرینوں کے اوقات درج تھے اور اُن اسٹیشنوں کے نام بھی جہاں گاڑیاں تبدیل کرنی تھیں۔

میں خوش ہوا کہ ایک نیا علاقہ دیکھوں گا جہاں طرح طرح کے نظارے ہوں گے۔ شاید وہاں کی تتلیاں اور پرندے اور قسم کے ہوں۔ پھل پھُول بھی مختلف ہوں۔

چھٹیاں شروع ہوئیں اور میں روانہ ہوا۔ آخری اسٹیشن پر والد صاحب ملے۔ تیس پینتیس میل کا سفر موٹر سے طے کیا جسے ایک ہٹّا کٹّا مضبوط شخص چلا رہا تھا۔ وہ ہم سے پنجابی میں باتیں کرتا رہا۔

نئی جگہ پہلے مقام سے بالکل مختلف تھی۔ ویران سے کیمپ کی بجائے یہ ایک آباد گاؤں تھا جس میں جگہ جگہ پُرانی شاندار عمارتوں کے کھنڈر تھے اور کسی سہ منزلہ عمارتیں، جو شکستہ حالت میں تھیں۔ ایک طرف بڑا سارا پختہ تالاب تھا اور ساتھ کی پہاڑی پر ٹُوٹا پھُوٹا سا قلعہ جہاں سنگِ سُرخ کی سیلوں کے بڑے بڑے ڈھیر تھے۔

گاؤں سے فرلانگ کے فاصلے پر ہمارا کُشادہ اور اُونچا مکان تھا جو کسی زمانے میں بہت نفیس ہو گا لیکن اب اس کی حالت خستہ سی تھی۔

والد صاحب کے آنے پر مکان کی مرمّت ہو رہی تھی۔ مزدور سفیدی کرتے کرتے مکّوں سے دیواروں کو کُوٹتے۔ گونج سی پیدا ہوتی تو وہ بتاتے کہ کمروں کی دیواریں کھوکھلی ہیں اور ان کے اندر راستے بنے ہوئے ہیں۔

ایک معمار بڑے سارے پتھر کو ہلانے کی کوشش کرتا رہا پھر تھوڑا سا سرکتا لیکن پھر واپس آجاتا۔ اُس نے سب کو اکٹھا کیا اور بتانے لگا کہ اس پتھر کو ہلانے سے ضرور کوئی خفیہ دروازہ کھلتا ہو گا۔ اور یہ کہ یہاں جگہ جگہ دروازے پوشیدہ ہیں جن کے نیچے سیڑھیاں اور تہہ خانے ہیں۔ یہاں سے ایک سُرنگ پرانے قلعے

تک جاتی ہے۔ اس جگہ دفینے بھی ضرور ہوں گے کیونکہ یہ کبھی پِنڈاروں کی حویلی تھی۔

پِنڈاروں کا نام میں نے پہلی دفعہ سُنا تھا اس لئے کئی سوال پوچھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ تقریباً سو سال پہلے پِنڈاروں نے اس علاقے میں تباہی مچا رکھی تھی۔ یہ چوروں، ٹھگوں، ڈاکوؤں کا ایک منظم گروہ تھا جو عوام کی جان اور مال کا دشمن تھا۔ رقم کے لالچ میں وہ کہیں معصوم ہم سفروں کا گلا گھونٹتے تو کبھی کسی گاؤں پر باقاعدہ ڈاکہ ڈالتے اور مال وصول کرنے کے لئے طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے۔ یہ مکان کسی زمانے میں اُن کا اڈّہ رہ چکا تھا۔۔ یہیں لُوٹ مار کے پروگرام بنتے، یہیں قیدیوں پر تشدّد ہوتا اور اسی جگہ راگ رنگ کی محفلیں جمتیں۔ تبھی یہاں اب تک پُراسرار آوازیں آتی ہیں۔ خصوصاً اندھیری راتوں میں جب ہوا کے تیز جھکّڑ چل رہے ہوں۔ چمگادڑیں اُڑ رہی ہوں، اُلّو بول رہا ہو، تو کبھی آہیں اور سسکیاں سُنائی دیتی ہیں۔ کبھی لوگوں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آتی ہیں اور تلواریں ٹکراتی ہیں۔ کبھی کبھی سازوں کی جھنکار اور نغمے سُنائی دیتے ہیں۔ پھر جیسے بہت سے آدمی سیڑھیوں پر چڑھتے اور اُترتے ہیں۔

اُنہوں نے مجھے تسلّی دی "یہاں عجیب عجیب باتیں ہوا کریں گی۔ اگر اُوپر کی منزل میں آگ کے شعلے نظر آئیں تو ڈرنا مت۔ اندھیرے میں کبھی دھماکے

سُنائی دیں اور کبھی دبی دبی چیخیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہر چھٹّی ساتویں رات یہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔"

اُس روز میں بہت ڈرا اور اپنے کھٹولے کو کھینچ کر والد صاحب کے پلنگ کے پاس لے آیا۔

امّی کو نئی جگہ پسند نہیں تھی۔ جب سے وہاں تبادلہ ہوا چھوٹی بہن لگاتار بیمار رہنے لگی۔ امّی کو پریشان کُن خواب نظر آیا کرتے۔

پھر ایک کمرے میں آیا کو کسی نامعلوم شے نے ایسا دھکا دیا کہ وہ مُنہ کے بَل گِری۔ حالانکہ صرف وہ کمرہ خالی تھا بلکہ آس پاس کے کمروں میں بھی کوئی نہیں تھا۔ مالن نے قسم کھا کر بتایا کہ گزشتہ رات اس نے تالاب میں ایک تھالی تیرتی دیکھی۔ تھالی میں چراغ جل رہا تھا۔ پاس کٹا ہوا ناریل رکھا تھا اور ایک چمکیلی لمبی چھُری۔۔۔ یہ کالا جادُو تھا۔ کوئی کسی کی جان کے درپے تھا۔

پھر پڑوس کے باغ میں دن دہاڑے ایک چیتا دیکھا گیا۔ مُوسلادھار بارش ہوئی تو یکایک باورچی خانے کی دیوار دھڑام سے گِری اور ساتھ ہی تانبے کی بڑی ساری دیگ جس کا ڈھکنا کھُلتے ہی چاروں طرف سفید اور زرد رنگ کے سِکّے اور چند زیور بکھر گئے۔

امّی نے کہا کہ یہ چیزیں منحوس سی ہیں اس لئے اُسی وقت گاؤں کے مکھیا کو بھجوا دیں۔ بعد میں منشی جی نے بتایا کہ اُنہوں نے زیورات میں چند انگوٹھیاں ایسی بھی دیکھی تھیں جو سُوکھی ہوئی اُنگلیوں میں تھیں۔

والد صاحب دورے سے واپس آئے تو اُنہوں نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ یہ البتّہ کہا کہ پُرانے سِکّے اور زیور مکھیا کو بھیجنے کی بجائے کسی میوزیم کے لئے بھیجے جاتے تو بہتر ہوتا۔

جب میں نے معماروں سے سُنی ہوئی باتیں بتائیں تو اُنہوں نے برسات کے موسم اور ہوا میں نمی کا ذکر کیا گیلی نمناک فضا میں آواز کی گونج بڑھ جاتی ہے، لہٰذا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ آواز کتنی دُور سے آ رہی ہے۔ جس روز بارش ہوتی ہے دُور دُور کی صدائیں یوں صاف سُنائی دیتی ہیں جیسے بالکل قریب سے آ رہی ہوں۔ اور پھر ہمارے مکان سے گاؤں صرف ایک فرلانگ ہی تو ہے۔ رات کو وہاں سے گانے بجانے کی صدائیں بھی آ سکتی ہیں۔

بچّوں کے رونے، جانوروں کے ڈکرانے اور لوگوں کے جھگڑنے کا شور بھی سنائی دے سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بارش کی رات کو یہ آوازیں دھوکہ دے سکتی ہیں۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا۔

اس علاقے میں جگہ جگہ ہفتہ وار ہاٹ (بازار) لگتے تھے۔ اُس روز آس پاس کے چیزیں فروخت کرنے والے ایک مقررہ جگہ اکٹھے ہو جاتے جِن سے گاؤں والے ہفتے بھر کا راشن خرید لیتے۔

ہمارے دونوں ملازموں کو سیر سپاٹے کا بڑا شوق تھا۔ تبھی وہ ہمیشہ کسی دُور کے ہاٹ کو چُنتے تاکہ سارادن باہر گزار سکیں۔

والد صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گئے ہوئے تھے۔ مجھے امّی سے ہاٹ پر جانے کی اجازت اس شرط پر ملی کہ سہ پہر سے پہلے واپس آجاؤں گا۔

فاصلہ فقط چند میل کا تھا۔ جو کچھ لینا تھا دوپہر تک خرید لیا۔ پھر مداری کا تماشہ دیکھتے رہے، جوگیوں کا گانا سُنا۔ ایک باغ میں آم اور جامنیں کھائیں، حتّٰی کہ شام ہو گئی۔

میں نے اُنہیں کئی مرتبہ یاد دِلایا کہ امّی میرا انتظار کر رہی ہوں گی، لیکن کسی نہ کسی طرح ٹال دیتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص پروگرام ہے جس کے انتظار میں وہ جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ اندھیرا ہو چُکنے کے بعد یہاں سے قریب ہی ایک رسم ادا کی جائے گی جو دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ اس علاقے میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اُس کا مشاہدہ کیا ہو گا، کیونکہ اس قسم کے واقعات کبھی کبھار ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ تماشہ دیکھے بغیر نہیں جانا چاہیے۔

پھر ہم عشاء تک گھر پہنچ جائیں گے اور بہانہ بنادیں گے کہ بارش کی وجہ سے ندیاں چڑھ آئی تھیں۔

میں نے پوچھا کہ وہاں کیا ہو گا۔ وہ کہنے لگے کہ اگر پہلے سُنا دیا تو سارا لطف جاتا رہے گا۔ خود دیکھ لینا۔

مغرب کے بعد ہم روانہ ہوئے اور ایک بَل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتے چلتے پہاڑی کے دامن میں رُک گئے۔

"وہ جگہ ہے۔" اُنہوں نے چند درختوں کی طرف اشارہ کیا جو دو پہاڑیوں کے بیچ میں تھی۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ سوائے اُن درختوں کے جہاں ایک لالٹین جل رہی تھی جس کے گرد بیس بائیس دیہاتی چُپ چاپ بیٹھے چلم پی رہے تھے۔
ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھے اور اُوپر کے پتھروں پر بیٹھ گئے۔

لگاتار خاموشی اور اندھیرے سے وحشت سی ہونے لگی۔ ملازموں نے سرگوشی کی۔۔۔ "بس اب ذراسی دیر ہے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں، اس کے نیچے ایک غار کا مُنہ ہے جس کے اندر بہت بڑا بُت ہے۔ یہ کالی دیوی کا ہے جس سے سب خوف کھاتے ہیں۔ یہ لوگ جو سامنے بیٹھے ہیں پڑوس کے گاؤں سے آئے ہیں۔ ابھی ایک مجرم وہاں لایا جائے گا جس پر یہ شُبہ ہے کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے غدّاری کی ہے۔ اسے ایک چراغ دیں گے جس میں اتنا تیل ہو گا جو آدھی رات تک جل سکے گا۔ اُسے غار کے اندر اکیلے جانا ہو گا اور دیوی کے سامنے آدھی

رات تک رہنا ہو گا۔ اگر وہ معصوم ہوا تو دیوی اُسے کچھ نہیں کہے گی۔ تب یہ سب لوگ اُسے معاف کر دیں گے۔ لیکن اگر قصوروار ہوا تو جُرم کی سزا پائے گا اور دیوی اسے تہس نہس کر ڈالے گی۔"

کچھ دیر کے بعد آہٹ سی ہوئی۔ دو آدمی ایک نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ غار کے سامنے اس کے ہاتھ سے بندھی ہوئی رسّی کھول دی گئی۔ چراغ روشن کیا گیا اور اس کے ہاتھ میں تھما کر سے غار میں دھکیل دیا گیا۔

غار کا مُنہ کشادہ نہیں تھا۔ اسے جھک کر داخل ہونا پڑا۔

میں نے پوچھا کہ کیا غار اتنا ہی تنگ ہے؟ لیکن ملازموں نے مجھے خاموش کرا دیا اور کان میں بولے کہ ایک دفعہ اندر پہنچ جاؤ تو غار میں کافی جگہ ہے۔ دیوی کا بُت ہاتھی جتنا ہے۔۔۔۔

ہم کافی اُونچی جگہ پر تھے اور بالکل چھُپے بیٹھے تھے۔ غار کا مُنہ ہم سے قریب تھا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ ایک منٹ گزرا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، غار کے اندر خاموشی تھی۔

"تُو اندر پہنچ چکا ہے؟" دفعتاً باہر والوں میں سے ایک آدمی چلّایا۔

"ہاں" غار میں سے آواز آئی۔

"چراغ جل رہا ہے؟"

"ہاں۔"

"دیوی نظر آرہی ہے؟"

"ہاں"

"اچھا۔ تو ہم غار کا مُنہ بند کرنے لگے ہیں۔"

وہ دو بڑی ٹہنیاں گھسیٹ کر لایا اور غار کا راستہ روک دیا۔

ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر نعرہ لگایا۔ "ہمیں یقین ہے کہ تو دیوی کی طرف پیٹھ کئے ایک کونے میں چھپا ہوا ہے۔ بُزدل کہیں کا۔ ہمّت ہے تو دیوی کی آنکھوں میری آنکھیں ڈال کر اس کے سامنے جا۔"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اگر تو دیوی کے پاس نہیں گیا تو وہ خود تیرے پاس آجائے گی۔"

کچھ دیر کے بعد اندر سے آواز آئی "اس کی لال لال زبان ابھی ہِلی ہے۔ وہ مجھے گھور رہی ہے۔"

غار میں سے آواز کبھی گونج دار سی آتی اور کبھی مدھم سی۔ کوئی فقرہ سمجھ میں آتا، کوئی نہیں۔

"آگے بڑھ کر بتا کہ تُونے کچھ نہیں کِیا۔" باہر کا آدمی چلّایا۔

"ابھی ابھی اس کی آنکھیں جھپکی ہیں۔ اس کے بازو بھی ہلے ہیں۔ یہ پتھّر کی نہیں، اس میں تو جان ہے۔"

"اس سے کہہ کہ تو بے قصور ہے۔"

"مجھ سے کیسی بھی قسم لے لو میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے باہر نکال کر جو بھی سزا چاہو دے دینا لیکن یہاں بند نہ رکھو۔"

"تجھے آدھی رات تک اندر رہنا ہو گا۔"

"عمر بھر تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ جو حکم دو گے مانوں گا، بس یہاں سے نکال لو۔ میں ابھی زندہ ہوں۔۔۔ وہ میری طرف آ رہی ہے۔"

دہشت زدہ آواز میں وہ التجا کر رہا تھا۔

میں نے ملازموں سے کہا کہ اس بے چارے کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ چپکے سے بولے کہ ہم مجبور ہیں۔ اگر ہم نے ذرا بھی کوشش کی تو یہ سارا گروہ ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔

غار کے قیدی پر ہذیان کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

"تم سب میرے بزرگ ہو۔ میرے عزیز ہو۔ مجھے باہر نکال کر زہر دے دینا۔ بھُوکا رکھ کر مار دینا۔ اس کے بازو میرے طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ میری طرف آ رہی ہے۔"

اور میں نے ملازموں سے کہہ دیا کہ اگر اُنہوں نے فوراً کچھ نہ کیا تو گھر پہنچ کر یہ سب کچھ بتا دوں گا۔

"لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

فوراً مجھے پہلوان کا خیال آ گیا۔ "اسی وقت جا کر پہلوان کو لے آؤ۔"

شام کو ہم پہلوان سے ہاٹ میں ملے تھے۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو والد صاحب کو اور مجھے اسٹیشن سے لایا تھا۔ بڑا طاقتور اور دلیر آدمی تھا۔ پہلوانی کے علاوہ اسے لاٹھی چلانے میں بھی مہارت تھی۔ بڑا مُنہ زور اور اکھڑ تھا۔ والد صاحب سے ملنے اکثر آیا کرتا۔ وہاں سب اس سے ڈرتے تھے۔

"پہلوان مٹھائی والے کی دکان پر ہو گا۔ اگر دوڑتے ہوئے گئے تو مل جائے گا۔" میں نے اصرار کیا۔

ملازم جو مقامی باشندے تھے ہچکچانے لگے۔ میں نے دوبارہ دھمکی دی کہ والد صاحب کو بتادوں گا۔ آخر ان میں سے ایک اُٹھا اور چُپکے سے نکل گیا۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر پہلوان آ گیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا۔

غار سے مدھم سی آواز آئی۔ "میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہیں۔ میں ہل نہیں سکتا۔ کچھ مدد کر سکتے ہو تو کر لو۔"

اس کے بعد کوئی صدا سُنائی نہیں دی۔

چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ درخت چُپ چاپ کھڑے تھے۔ ہوا ساکن تھی۔ جھینگر تک خاموش تھے۔

ایک ایک لمحہ طویل ہوتا گیا۔ سکوت اور گہرا ہو گیا حتّٰی کہ سب چیزیں بے جان معلوم ہونے لگیں۔ اور وہ سارا منظر جیسے بھیانک خواب میں تبدیل ہو گیا۔

جیسے صدیاں گزر گئیں اور پتّہ تک نہ ہِلا۔

آخر ایک سمت میں کھڑکا ہوا۔ ٹارچ کی روشنی اور بھاری قدموں کی آہٹ سے معلوم ہوا کہ کوئی آرہا ہے۔ پہلوان پہنچ گیا تھا۔

وہ ہمارے قریب سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھا اور چہرے پر غصّے کے آثار۔ وہ ان سب کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ سیدھا اُن کی طرف لپکا اور ان پر لاٹھی، مکّوں اور ٹھوکروں سے پِل پڑا۔

"پہلوان آگیا۔ دوڑو یہاں سے۔" نعرہ لگا اور بھاگڑ پڑ گئی۔

اُس نے غار کے مُنہ سے ٹہنیاں کھینچیں اور اندر چلا گیا۔ غار کے بیہوش قیدی کو کندھوں پر لاد کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

گھر پہنچ کر میں نے موسلادھار بارش اور چڑھی ہوئی ندیوں کا بہانہ کر دیا اور کچھ نہ بتایا۔

اگلے روز ملازموں سے معلوم ہوا کہ پہلوان اس غریب کو کندھے پر اُٹھا کر گاؤں لے گیا۔ پھر موٹر میں لِٹا کر قصبے کے ہسپتال میں پہنچا جہاں ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے کہ یہ بچ جائے گا۔ پہلوان نے پولیس کو بھی رپورٹ کر دی ہے۔

والد صاحب کو شاید پہلوان نے بتا دیا ہو۔ اگرچہ اُنہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کے بعد جب کبھی دورے یا شکار پر جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے۔

ایک روز ہم اُسی غار کے قریب سے گزرے۔ میں ٹکٹکی باندھے غار کے مُنہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھانپ گئے اور کہنے لگے کہ یہ اور ایسے ہی کئی اور بُتوں والے غار اس علاقے میں ہیں۔ مختلف مذہبی طبقوں کے لوگ طرح طرح کی مورتیوں کو پوجتے ہیں، منّتیں مانتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ ان ہی میں کچھ ایسے غار بھی ہیں جن میں پِنڈاروں کی دیوی کے بُت ہیں۔ پِنڈاروں نے وسطِ ہند کے سارے علاقے میں طوفان بپا کیا ہوا تھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد افراتفری کے زمانے میں جتنے چور، اُچکّے، ڈاکو اور ٹھگ آئے اُن میں سب سے ظالم اور سنگدل پنڈارے تھے جو کالی دیوی کے نام پر معصوم لوگوں کو لُوٹنے کے لئے قتل کیا کرتے۔ ان دنوں مہاراجہ اور نواب کی اپنی ذاتی فوج ہوا کرتی چنانچہ جو شخص کا جی چاہتا اپنی پسند کی وردی پہن لیتا۔ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا کہ وہ واقعی سپاہی ہے یا نہیں۔ کبھی پنڈارے اپنے آپ کو سپاہی ظاہر کرنے کے لئے وردی پہن لیتے۔ کبھی سیدھے سادے راہگیروں کا روپ بھرتے اور کبھی مالدار مہاجن بن جاتے۔ مقصد صرف ایک ہوتا کہ کسی طرح معصوم مسافروں سے واقفیت کر کے ان کے ساتھ ہو لیں۔ پھر ایک منظّم سازش کے تحت موقع پاتے ہی درختوں کے جھنڈ میں یا کسی ندّی کے کنارے جہاں قبریں پہلے سے کھود دی جا چُکی ہوتیں، وہاں آناً فاناً اپنے ساتھی مسافروں کا گلا گھونٹ ڈالتے۔ ان کا ہتھیار معمولی سا رومال ہوتا جس کے ایک کونے پر سِکّہ باندھتے۔ اپنے شکار کی پُشت سے

رومال کو اس استادی سے گھماتے کہ سِکّے والا کونا گردن کو لپیٹتا ہوا گھوم کر واپس آ جاتا اور رومال کے دونوں کونے کھینچ کر گلا دبا دیا جاتا۔ یہ کاروائی چشمِ زدن میں ختم ہو جاتی۔۔۔ یا پھر پنڈارے اپنے کسی سردار کی کمان میں گاؤں یا قصبے پر باقاعدہ حملہ کرتے۔ محاصرے کے بعد ایک ایک کو پکڑ لیا جاتا اور ایذائیں دے کر ان کی ساری پونجی وصول کی جاتی۔ اُن دِنوں سفر کرنا بھی خطرناک تھا اور اس علاقے میں کہیں رہنا بھی مشکل تھا۔۔۔ آخر پچھلی صدی میں انگریزوں نے ان کے خلاف مہم شروع کی اور انہیں بالکل ختم کر دیا۔ تب کہیں لوگوں کو نجات ملی۔ پنڈارے جا چکے ہیں۔ لیکن اُن کی نشانیاں باقی ہیں۔ کالی کے بُت عجیب عجیب رسمیں اور وہ گروہ جو ایسی رسموں پر اعتقاد رکھتے ہیں، غالباً اس غار میں بھی کالی کی مورتی ہو گی۔ صدیوں سے انسان بُتوں کو پوجتا چلا آیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرستش فقط ایک ہستی کے لئے روا ہے۔ اور وہ ہے اُس خالق کی ذات۔ باقی سب وہم ہے۔ انسان کے ذہنی انتشار نے لا تعداد ہیولے بنا کر کھڑے کر دیئے۔ اور انہیں صرف وہ لوگ مانتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کے ماننے کے خواہشمند ہوں۔ پِنڈاروں نے کالی کو اس لئے چُنا کہ وہ اُن کے مقصد کے لئے موزوں ترین تھی۔ اگر وہ کالی کو نہ بھی مانتے تب بھی اتنے ہی ظالم رہتے۔۔۔۔"

امّی برابر اصرار کر رہی تھیں کہ اس منحوس مکان کو چھوڑ دینا چاہیے۔

ایک رات آیا نے دو تاریک سائے دیکھے جو ایک اور سائے کو کندھوں پر اُٹھائے چل رہے تھے۔ اُسے کئی روز تیز بُخار رہا۔

گودام کی صفائی کراتے وقت دو چھوٹی چھوٹی ڈراؤنی سی مورتیاں ملیں۔ امّی کے کہنے پر انہیں زمین میں دبا دیا گیا۔ پھر اُوپر کی منزل میں آگ لگ گئی جسے مشکل سے بجھایا گیا۔ آگ لگنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ نہ آس پاس کوئی آدمی تھا اور اس وقت تیز بارش بھی ہو رہی تھی۔

آخر والد صاحب نے وہ مکان چھوڑ دیا اور ہم کیمپ میں چلے گئے۔ چلتے وقت مُکھیا کی بیوی ملنے آئی اور امّی کو بتایا کہ تم سے پہلے جو کُنبہ اس مکان میں رہتا تھا اُن کا اکلوتا بچّہ اُن چھوٹی چھوٹی مورتیوں سے کھیلا کرتا۔ ایک روز نہ جانے اس سے کیا غلطی ہوئی کہ کسی نامعلوم چیز نے اسے لہولہان کر دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنے بچّے صحیح سلامت لے کر جا رہی ہیں۔" وہ بولی۔

والد صاحب پنجاب کے تبادلے کے لئے دیر سے کوشش کر رہے تھے۔ آخر وسطِ ہند کی سترہ سالہ ملازمت کے بعد وہ پنجاب میں آ گئے۔

عرصے تک وہ علاقے اور وہاں کی باتیں ہمیں یاد رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یادیں دھندلی پڑنے لگیں۔

ڈاکٹری کی تعلیم نے سی پی کے بھُوت پریت بھُلا دیئے لیکن وہ غار کا واقعہ یاد رہا۔ خاص طور پر کسی چاروں طرف سے گھِری ہوئی بند جگہ میں تو اکثر یاد آ جاتا۔

پڑھائی کے سلسلے میں سکاٹ لینڈ گیا تو کوئلے کی کانوں میں جانا پڑا۔ نیچے اُترتے ہی غار کا خیال آ گیا۔ اور میں بہانہ کر کے باہر نکل آیا۔

اسی طرح سمندری جہاز کا چھوٹا کیبن، کسی مکان کا تہہ خانہ، چھوٹے ہوائی جہاز کا سفر، اس قسم کی گھُٹی ہوئی جگہیں وہ سانحہ یاد دِلا دیتیں۔ قاہرہ میں اہرام دیکھتے ہوئے جب جھک کر اُس تنگ سُرنگ میں داخل ہوا اور فرعون کے مدفن کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچا تو فوراً غار کے قیدی کی آواز کان میں گونجنے لگی۔

پھر اتفاق سے ایک فوجی کورس پر سی پی جانے کا موقع ملا۔

اُس غار کو دیکھنے کا تجسس مجھے اُسی گاؤں کی طرف کھینچ رہا تھا جو ٹریننگ سنٹر سے دور نہیں تھا۔

اپنے ساتھیوں سے پُرانے واقعات کا ذکر کیا تو وہ خوب ہنسے، خصوصاً انجنیئر جو عمارتیں ڈیزائن کرتا تھا اور رسالے کا ایک تجربہ کار افسر جو حال ہی میں برما کے محاذ سے واپس آیا تھا اور وہاں لاتعداد ڈراؤنی مورتیاں دیکھ چکا تھا۔

ان دونوں نے خوب مذاق اُڑایا۔

آخر میں نے ان دونوں کو مجبور کر دیا کہ پکنک کے لئے وہاں چلے چلیں۔

اتوار کے ساتھ سنیچر کی آدھی چھُٹّی ملا کر ہم روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ہمارا سہ منزل مکان کبھی کا گر چُکا تھا۔ گاؤں میں پُرانے ملازموں کو تلاش کیا لیکن کسی کا پتہ نہ چل سکا۔

مکھیا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے لڑکے کو غار کے متعلق علم نہیں تھا، لیکن وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔

ہم بَل کھاتی ہوئی پگڈنڈی سے اُن جانی پہچانی پہاڑیوں میں جا پہنچے۔

انجنیئر نے چراغ جلا کر ہاتھ میں لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم اندھیرے غار کے مُنہ میں جھک کر داخل ہوئے۔

دس بارہ قدم چلنے کے بعد غار کی چھت اُونچی ہوتی گئی۔ اندر مکمل تاریکی تھی اور سوائے اس راستے کے کہ جس سے ہم آئے تھے کوئی روزن نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ اندھیرا کم ہونے لگا اور آنکھوں کو صاف دکھائی دینے لگا۔

ہاتھی جتنا بُت ہمارے سامنے تھا!

اُس کی اُبلتی ہوئی سُرخ آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ لال زبان جبڑوں سے باہر لٹک رہی تھی اور طویل بازو یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے ابھی کسی کو دبوچ لیں گے۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ بچپن میں یہاں سُنا تھا وہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے اور غالباً اس کے بعد بھی کئیوں کو بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اس غار میں لایا گیا ہو گا۔

اس گیلے گیلے بند اور تاریک مقام میں کئی گھنٹے تنہا ٹھہرنا پڑے تو بُت کے خوف کے علاوہ شاید دیگر عناصر بھی اثر ڈالیں۔

تازہ ہوا کی کمی۔۔۔جلتے ہوئے چراغ کا جمع ہوتا ہوا دھواں، کاربن ڈائی آکسائیڈ جیسی گیسیں، ناکردہ اور کردہ خطاؤں کا احساس، اور اَنجانے نتائج کا خوف، ان کے علاوہ فوق الفطرت قوّتوں کا وہم، یہ سب حواس پر اثر ڈالتے ہوں گے۔

ایک انجنیئر نے خوشی کا نعرہ لگایا"وہ دیکھو، اس کی آنکھیں حرکت کر رہی ہیں۔"

اس نے چراغ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بائیں طرف ہٹنے کو کہا۔

جب میں بائیں رُخ چلا تو دیوی کی آنکھیں واقعی دو مرتبہ جھپکیں۔

"آنکھوں کو کسی خاص پتھر سے بنایا گیا ہے اور کاریگروں نے اُنہیں ایسی مہارت سے تراشا ہے کہ اگر روشنی کے منبع کر اِدھر سے اُدھر لایا جائے تو منعکس ہوتے ہوئے روشنی مچلنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آنکھیں جھپکی ہوں۔ یہ نظر کا دھوکہ ہے اور بڑی اُستادی سے ساخت کیا گیا ہے۔"

انجنیئر نے میرے ہاتھ سے چراغ لے لیا۔ چند قدم آگے بڑھ کر پیچھے ہٹا۔ پھر ترچھے رُخ میں یہی عمل دوہرایا۔

"یہ دیکھا؟ یہاں چراغ لئے کھڑے رہو تو بُت کے نچلے دو بازو نظر آتے ہیں۔ اِس طرف ہٹو تو روشنی فقط اُوپر کے بازوؤں سے منعکس ہوتی ہے۔ اُس طرف جاؤ تو صرف درمیان کے بازو چمکتے ہیں۔ یعنی ہر جگہ سے بازوؤں کی ایک جوڑی نظر آ سکتی ہے۔ لیکن چراغ کو ذرا ہٹاؤ تو فوراً اس کی جگہ دوسری جوڑی سامنے آ

جاتی ہے۔ پھر تیسری۔ غار میں جُنبش کرنے والا محتاط نہ ہو تو یہی سمجھے گا کہ بازو ہل رہے ہیں۔ کاریگری کا کمال ہے۔"

چراغ کا دُھواں اکٹھا ہو رہا تھا۔VENTILATION نہ ہونے کی وجہ سے غار کی ہوا بوجھل ہوتی جارہی تھی۔

اور ہم چاروں چُپ چاپ کھڑے تھے۔ رسالے کا جہاندیدہ افسر وکو ذرا دیر پہلے قہقہے لگا رہا تھا، انجنیئر جس نے ابھی ابھی نہایت ٹھوس سائنٹیفک دلائل پیش کئے تھے، مکھیا کا لڑکا جو شاید یہاں دوبارہ آئے گا اور میں، جس کا تجسس جُوں کا تُوں تھا۔ ہم یوں خاموش اور مؤدبانہ کھڑے تھے جیسے کسی نامعلوم طاقت نے ہمیں باندھ کر رکھ دیا ہو۔

وقت گزرتا گیا۔ آہستہ آہستہ یوں لگا جیسے وہی بُت پہلے سے دُگنا ہو گیا ہو، پھر تگنا۔ اس کی سُرخ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اس کے بازو ہماری طرف بڑھنے لگے۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے سانس گھُٹ رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھا گئی۔ جُنبش کرنی چاہی تو جیسے قدم زمین میں دھنسے ہوئے تھے۔

دفعتاً یوں لگا کہ ہم میں سے کوئی بھی ہل نہیں سکتا۔

پھر کچھ گھُٹی ہوئی سی آواز آئی "خدا کے لئے مجھے باہر نکالو۔"

افواہیں

سین

دوسری جنگِ عظیم کے دوران۔ ایک چھاؤنی کے کلب میں سنیچر کی رات۔

شارٹی (SHORTY) دُور کونے میں ایک سٹول پر چڑھ کر آئینے کے سامنے اپنی ٹائی ٹھیک کر رہا ہے۔

نوزی (NOSY) پیانو پر خاصی بے سُری آواز میں کپلنگ کے یہ اشعار گانے کی کوشش کر رہا ہے مگر پیانو اور گانے میں کوئی تعاون نہیں۔

"یہ چھ میرے خاص ساتھی، مجھے رکھتے ہیں چوکنّا،

جو کچھ میں جانوں ہوں بس ان کی بدولت ہے

اور نام ہیں ان کے یہ

کون؟ کہاں؟ اور کیوں؟

کیسے؟ کیا؟ اور کب؟"

فیٹی (FATTY) جو چوتھا بڑا اسارا چاکلیٹ کھا رہا ہے۔ نوزی کو ٹوکنے کے لئے اس کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کا رُخ بڑے ہال کی جانب ہے جہاں رقص ہو رہا ہے۔

فیٹی: (اُسے روک کر) ہیلو نینسی (NANCY) آؤ کچھ پیؤ۔

نینسی: شکریہ۔

فیٹی: سُناؤ کیا حال ہے؟

نینسی: یونہی سا ہے۔ مگر اس سے بُرا کیا ہو سکتا تھا۔

نوزی: (پیانو چھوڑتے ہوئے) اس مرتبہ تو بہت دنوں کے بعد نظر آئیں۔ کہاں رہیں؟ اب یہ بہانے مت بنانا کہ دفتر میں کام بہت زیادہ تھا۔

نینسی: بہانہ نہیں، سچ مچ میں بے حد مصروف رہی۔ آدھی آدھی رات تک دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ نہایت اہم احکامات ٹائپ کرنے کے سلسلے میں۔

نوزی: پھر تو کسی کے ساتھ سینما یا تھیٹر بھی نہیں جا سکی ہو گی۔

نینسی: نہیں! دراصل اُس سے میری لڑائی ہو گئی۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ میرا بی ایف یکا یک بدل کر کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ اب وہ ذہنی رفاقت، انٹلکچوئل دوستی، روحانی محبّت جیسے مشکل الفاظ لگاتار دوہراتا رہتا ہے۔ حالانکہ پہلے اس کی اُوٹ پٹانگ باتوں کا نہ سر ہوتا تھا نہ پیر۔ اور تو

اور، کیا تو میک اَپ کی عمدہ چیزیں اور نفیس خوشبوؤں کے تحفے دیا کرتا اور کیا اب بس کتابیں ہی کتابیں رہ گئی ہیں۔ ہر ہفتے رنگین کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی کتاب بھیج دیتا ہے یا لے آتا ہے۔ پرسوں بھی ایک کتاب دی تھی۔

نوزی: کیسی تھی؟

نینسی: مزاحیہ تھی۔ لیکن پھر بھی دلچسپ لگی۔ بہرحال مجھے شُبہ ہو چلا ہے کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ یا تو اسے کوئی اور لڑکی پسند آ گئی، یا پھر اس کا تبادلہ ہونے والا ہے۔

نوزی: بڑی سمجھدار ہو۔ فوراً تاڑ گئیں۔

نینسی: جب بی ایف سے صاف صاف باتیں ہوئیں تو آئیں بائیں کرنے لگا۔ لیکن میں نے بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخر بول ہی پڑا کہ یہ سرکاری راز ہے جو لڑکیوں کو نہیں بتایا جا سکتا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ ہم کوئی بھی راز افشا نہیں ہونے دیتیں، بلکہ ایک ایک راز کی حفاظت کئی کئی سہیلیاں مِل کر کیا کرتی ہیں لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

فیٹی: ویسے یہ بی ایف ہوتا کیا ہے؟

نینسی: (شرما کر) بوائے فرینڈ۔

فیٹی: معاف کرنا میں کچھ اور سمجھا تھا۔ (اپنے آپ سے "یعنی بلڈی فول۔ ممکن ہے کہ ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہ ہوتا ہو۔")

نینسی: سہیلی جو میرے کمرے میں رہتی ہے، میری جی ایف ہے، یعنی گرل فرینڈ۔ اس کا بی ایف بھی سروس میں ہے۔ وہ انٹیلیجنٹ آفیسر ہے۔

فیٹی: غالباً تمہاری مراد انٹیلیجنس آفیسر سے ہے۔

نینسی: جی بالکل وہی۔ اور وہ بڑے دفتر میں کام کرتا ہے۔ ایسے افسر تو بیحد ذہین ہوتے ہوں گے۔

فیٹی: اس انٹیلیجنس کا اس ذہانت سے جو تم سوچ رہی ہو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ خیر تو کیا ہوا اس بی ایف کو؟

نینسی: وہ بھی یہاں سے فرار ہو کر جنگ پر جا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارے سمارٹ نوجوان سب کچھ چھوڑ کر محاذوں کا رُخ کر رہے ہیں۔ بھگوڑے کہیں کے۔

فوزی: (فیٹی کے کان میں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورا بریگیڈ سمندر پار جانے والا ہے۔ (نینسی سے) ان کی منزل کا کوئی اندازہ ہے تمہیں؟

نینسی: (ٹھنڈا سانس بھر کر) شادی اب ان کی منزل نہیں معلوم ہوتی۔ سیلی تو اس قدر خفا ہوئی کہ بی ایف کو سب کے سامنے خوب لتاڑا اور صاف

صاف کہہ دیا کہ اگر جانے سے پہلے تم نے انگوٹھی نہیں پہنائی تو میرا انگوٹھا تمہارے حلق پر ہو گا۔

فوزی: تمہاری جی ایف کی منزل کا نہیں پوچھ رہا بریگیڈ کا ذکر کیا تھا۔

نینسی: اس کا مجھے علم نہیں۔ ویسے سیلی کا بی ایف کسی سبز یا نیلے یا سُرخ یا زرد بخار کا حفاظتی ٹیکہ لگوانے کی ڈینگیں مار رہا تھا۔ کاش کہ یہ بخار اسے چڑھ جائے اور اس کی طبیعت صاف کر دے۔

فوزی: (آہستہ سے) Yellow Fever۔ اس کا مطلب ہوا افریقہ۔

فیٹی: تمہیں تو بہت کچھ معلوم ہونا چاہیے۔ تم جیسی قابل STENO تو یہاں کوئی بھی نہیں۔ اور پھر اتنی سمارٹ، حسین اور من موہنی۔

نینسی: سچ مچ، اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔

فیٹی: حد ہو گئی۔ اتنی خوبیوں والی لڑکی بھی کسی نے دیکھی ہے؟ کیا رُوپ ہے۔ کیا جمال ہے۔ کیا جاذبیت ہے۔ اچھا ہوا کہ میں سوشل ہوتے ہوئے بھی سوشلسٹ نہیں ہوں، ورنہ پوچھتا کہ نینسی کو اس قدر حسن HOARD کرنے کا کیا حق ہے۔ معمولی خوش شکلی کافی تھی۔

نینسی: ہٹیئے بھی، کسی اور کو بنایئے۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ جونہی کوئی حسینہ نظر آ جائے، آپ فوراً اُس کی تعریفیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ آپ کی پرانی عادت ہے۔

فیٹی: اور پھر لباس کیسا زرق برق ہے۔ شوخ اور قیمتی بھی۔ اور کتنا جچ رہا ہے۔

نینسی: اُف اللہ، بھلا یہ کیسے بتا دوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ مشرقِ وسطٰے کی سمت میں جا رہے ہوں۔

نوزی: کتنی نفری؟

نینسی: پتہ نہیں۔

فیٹی: بھلا ان وجد آور نگاہوں کی کوئی تاب لا سکتا ہے؟ اُدھر کنگن، گلے کے ہار اور کانوں کے بُندوں کا بالکل ایک سا ڈیزائن۔ ساتھ ساتھ یہ مسحور کُن خوشبو، سب مل کر غضب ڈھا رہے ہیں۔ (نوزی کی طرف معنی خیز اشارہ کرتا ہے کہ وہ بھی کچھ کہے)۔

نوزی: واقعی، نینسی ان گنی گنائی لڑکیوں میں سے ہے جو جمائی لیتے وقت بھی حسین لگتی ہیں۔

نینسی: آپ کے ذکر کرنے پر یونہی یاد آ گیا کہ شاید میری جی ایف نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ بڑے صاحب کی سیکرٹری نے اپنے بی ایف کو تاکید کی کہ خبردار جو کسی کو بتایا کہ پہاڑی علاقوں سے ایک یا دو پلٹن نہیں بلکہ پوری چھ کی چھ ہٹائی جا رہی ہیں۔ مجھ سے بھی وعدہ لیا گیا تھا

کہ کسی اور تک خبر نہ پہنچے، مجھے یقین ہے کہ میری بات کا آپ بھی کسی اجنبی سے ذکر نہیں کریں گے۔

شارٹی: (جو آہستہ آہستہ قریب آ چکا ہے۔) جناب ایریا آرڈر نمبر جی۔ پی۔ او/۳۵/ایل بی ڈبلیو/۴۱ کے حوالے سے یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس قسم کی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔

نوزی: اس گفتگو میں کیا خرابی ہے؟ کہ کیا ہم چاروں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے؟ (فیٹی سے سرگوشیوں میں) بھلا تمہیں UNITS کی نقل و حرکت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ مُٹاپے اور جوڑوں کے درد کی وجہ سے تمہاری میڈیکل Category ڈاؤن ہو چُکی ہے۔ اور پھر جس کی کیٹیگری 'A' نہ ہو، اسے تبادلوں کا اتنا سا بھی فکر نہیں ہونا چاہئے۔

فیٹی: یہ بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے مکان کی تلاش ہے۔ مدّت سے وٹینگ لِسٹ پر ہوں۔ جب یہاں آیا تھا اور درخواست دی تھی تو فہرست میں میرا نمبر چھیالیس تھا۔ اور اتنے دنوں کے بعد بھی چھیالیس ہی ہے۔ کہیں سینتالیسواں نہ ہو گیا ہو۔

نوزی: پتہ نہیں کیا وجہ ہے، یہاں عرصے سے پولو کا میچ نہیں ہوا، نہ نیزہ بازی دیکھی۔ کہیں یہ رسالے والے تو باہر نہیں جا رہے۔ چلو سنی(Sunny) سے پوچھتے ہیں۔

(نینسی رقص کے لئے چلی جاتی ہے)

فیٹی: ہیلو اجنبی، کیسے ہو؟

سَنی: (مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے) میں نے ان دنوں سے بہتر وقت بھی دیکھا ہے۔

نوزی: تمہارے باس کا کیا حال ہے؟ اتنی مدّت کے بعد بھی وہ تم پر کچھ اعتبار کرنے لگا ہے یا اُسی طرح خاموش اور شکّی ہے؟

سَنی: بالکل ویسے کا ویسا ہے، ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ اور یہ کہ صرف کچھ نہیں بتاتا بلکہ مجھے دیکھتے ہی کاغذات چھپا لیتا ہے، فائلیں ڈھانپ دیتا ہے۔ میری غیر موجودگی میں دوسروں سے میری برائیاں بھی کرتا ہے۔ لیکن مجھ جیسے ملنگ کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ حالات خواہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں، جولیس سیزر والا رویّہ ہی ٹھیک رہتا ہے۔ جب اُسے روم سے جلاوطن کرنے کی دھمکی دی گئی تو اُس سے دھڑلّے سے اعلان کیا کہ تم سب کی ایسی کی تیسی، تم کیا جلاوطن کرو گے۔ میں

پوری سلطنت سے روم کو جلاوطن کرتا ہوں۔ پھر یہ ہے کہ دوسرے جو بھی کہیں اُنہیں کہنے دو۔ اپنے پرانے سکول کا Mottoتو تمہیں یاد ہو گا

They Say.

What They Say.

Let Them Say.

فیٹی: کیابات کی ہے سَنی۔شاباش!

سَنی: دُنیاطرح طرح کے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر جگہ قسم قسم کے نمونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ عام الفاظ کے معنے بھی ہر جگہ مختلف ہیں۔ مثلاً اٹلی میں اچھے کھلے کشادہ ہال کو کیمرہ کہا جاتا ہے۔ اور فرش جیسی چیز کو جو کسی قسم کی موسیقی پیدا نہیں کر سکتی، اسے پیانو کہتے ہیں۔ اور خانساماں جو اب کچن میں کھانا پکاتا ہے۔ کبھی یہ نام خانِ ساماں تھا جو ترکوں اور مغلوں کی عظیم فوجوں کا کوارٹر ماسٹر جنرل ہوا کرتا۔ کامیابی کا فارمولا شاید مجھے معلوم نہ ہو لیکن ناکامی کا نسخہ یہ ہے کہ ہر شخص کو خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

باپ، بیٹا اور ان کے گدھے والی وہ پرانی حکایت تو یاد ہو گی۔ جب باپ گدھے پر سوار تھا تو پبلک نے اسے بے رحم کہا کہ معصوم لڑکے کو

پیدل چلا رہا ہے۔ باپ نے اُتر کر بیٹے کو بٹھا دیا تو دیکھنے والے ملامت
کرنے لگے کہ نئی پود بزرگوں کا ادب نہیں کرتی۔ دونوں سوار ہو گئے
تو فقرے کسے گئے کہ اتنا بوجھ لاد کر بے زبان حیوان پر ظلم ڈھایا جا رہا
ہے۔ جب باپ، بیٹا اور گدھا تینوں پیدل چلنے لگے تو اعتراض کیا گیا کہ
سواری کا جانور موجود ہے اور یہ بے وقوف اپنے آپ کو ناحق تھکا رہے
ہیں۔ آخر تنگ آ کر دونوں نے گدھے کو ڈنڈے سے لٹکا کر کندھوں
پر اُٹھا لیا تو راہگیروں نے انہیں پاگل سمجھ کر ایسے نعرے لگائے کہ
گدھا بِدک کر دریا میں گِر گیا مگر دیکھنے والے پھر بھی مطمئن نہ
ہوئے۔

نوزی: تمہارا باس مجھے بھی پسند نہیں کیونکہ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ مگر
دانستہ طور پر کاغذات اور فائلیں ڈھانپنا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی بھی PLAN کا علم ہو۔

سَنی: اس کا پتہ بہت کم لوگوں کو ہے کہ وہ بڑا گھُنّا ہے۔ ہر چیز، ہر بات،
یہاں تک کہ اپنے جذبات و تاثرات تک کو چھُپا لیتا ہے۔ یوں تو بظاہر
وہ ہر پیچیدہ کیس کو "TO HELL WITH" کہہ کر ٹال دیتا ہے
لیکن شاید نہیں جانتا کہ اس قماش کے آدمی کو شیطان جہنّم تک میں
داخل نہیں ہونے دے گا۔ اُسے ایک مرتبہ میدانِ جنگ میں جانے

کا بھی موقع ملا۔ وہاں اس نے جس دلیری سے بزدلی دکھائی اس کا کوئی جواب نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ لفظ سولجر کا لاطینی ماخذ SOLDATO ہے یعنی فروخت کیا ہوا۔ دوسرے لفظوں میں جو مُلک کے لئے بِک جائے وہ سولجر ہے۔ میں نے دبے الفاظ میں اس امر کا ذکر بھی کیا لیکن اس نے نسوار کی چٹکی سے چند چھینکیں مار کر موضوع بدل دیا۔ ویسے ان دِنوں وہ یہی تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا کام انتہائی TOP SECRET ہے۔ اتنا کہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ سُرخ لائنوں والی بیحد خفیہ فائلوں کو دوہرے قفل میں رکھ کر سمجھتا ہے کہ سب کچھ پوشیدہ رہے گا اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ نہ صرف ایک سو دو بریگیڈ باہر جا رہا ہے بلکہ دو سو تین بھی اور اڑتالیس اور اکسٹھ بریگیڈ بھی۔ یہ باتیں میں تمہیں کبھی نہ بتاتا لیکن اس کی تنگ نظری اور مشکوک ذہنیت نے کہلوا دیں۔ اور پھر دیکھا جائے تو یہ خفیہ اور انتہائی خفیہ کا ریکٹ بھی عجیب ہے۔ اگر کسی راز کو اتنا ہی قیمتی سمجھا جائے تو اسے متعلقہ لوگوں تک زبانی پہنچانا چاہیے یا پھر خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر۔ لیکن کلرکوں سے اس کی کئی کئی کاپیاں ٹائپ کرانے کے بعد دوسرے ملازمین سے ڈسپیچ کرانے کے بعد یہ توقع رکھنا کہ یہ خبر اِدھر اُدھر

نہیں نکلے گی، یہ منطق میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ مِثل مشہور ہے کہ سانڈ کو قابو میں لانا ہو تو اس کے سامنے جا کر سینگوں سے پکڑو، نہ کہ اُس کی دُم سے۔

فیٹی: آرڈر تو وہ ہوا کرتے تھے جو چین کا ایک پرانا بادشاہ اپنے ماتحتوں کو بھیجا کرتا۔ فقط تین فقروں کے ساتھ۔ "حکمنامے کو بغور پڑھو۔ تھر تھر کانپو، اور فوراً عمل کرو۔"

نوزی: خفیہ رازوں کی آڑ لینے کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ پچھلے ہفتے چند دوست آ گئے۔ کلب سے واپسی میں اکثر دیر ہو جایا کرتی۔ پرسوں رات جب ڈھائی تین بجے واپس لَوٹا تو بیوی بر آمدے میں منتظر ملی۔ اس کی باز پُرس پر میں نے یہی فقرہ استعمال کیا کہ وجہ بتانے سے معذور ہوں کیونکہ یہ سرکاری راز ہے۔

شارٹی: (قریب آ کر) جناب مجبور ہو کر پھر یاد دہانی کرا رہا ہوں۔ ذرا خیال رکھیئے۔ ملازم ہماری باتیں سُن رہے ہیں۔ ایک تازہ انسٹرکشن کے مطابق ایسی جگہوں میں خاص طور پر محتاط رہنا چاہیے۔

فیٹی: اور ایک اُس سے بھی نئی انسٹرکشن کہتی ہے کہ تمہیں کچھ پینا چاہئے۔ (زور سے) کوئی ہے؟

آبدار: (جو فقط چار پانچ فِٹ دور تھا) جناب!

فیٹی:　صاحب کو نمبو پانی دکھاؤ۔

نوزی:　بھلا نوکروں کو ہماری باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ گفتگو تو بالکل ٹیکنیکل ہے۔ (بیرے سے) کیا تم ہماری باتیں سُن رہے تھے؟

بیرا:　جی نہیں۔

نوزی:　دیکھا؟ اور پھر انہیں انگریزی کہاں آتی ہے۔ (بیرے سے) تمہاری فیملی کہاں ہے؟

بیرا:　گاؤں میں۔

نوزی:　وہاں بچّہ لوگ کی ایجوکیشن کا کیا ارینجمنٹ ہے؟

بیرا:　جناب میرے بچّے نہیں ہیں، بس اکیلی فیملی ہے جو اپنی ماں کے پاس رہتی ہے۔

نوزی:　اچھا بتاؤ کہ MORAL اور MORALE میں کیا فرق ہوتا ہے؟

بیرا:　مورل کا تو پتہ نہیں، لیکن مورال وہ ہے جو سپاہیوں کا بلند کیا جاتا ہے۔

فیٹی:　صاف صاف بتاؤ، تمہیں انگلش آتی ہے یا نہیں؟

بیرا:　صاحب، انگلش آتی تو اب تک بیرا ہی رہتا؟

نوزی:　سُن لیا؟ میں نہ کہتا تھا کہ یہ ہماری باتیں نہیں سمجھ سکتے۔

شارٹی:　(آہستہ سے) ہمیں پچھلے ہفتے ہی یہی بیرا ٹیلیفون پر انگریزی میں جواب دے رہا تھا۔

فیٹی: تمہیں وہم ہوا ہو گا۔ (بیرے سے) شاباش! جب مجھے مکان ملا تو تمہیں ملازم رکھ لوں گا۔ یعنی اگر کبھی مکان ملا تو۔

بیرا: جناب، اب تو دیر نہیں لگنی چاہیے کیونکہ توپ خانہ بھی جا رہا ہے۔ کافی کوٹھیاں خالی ہو جائیں گی۔

فیٹی: تمہیں کیسے پتہ چلا؟

بیرا: ان کے بڑے افسر کا ڈرائیور اور باورچی دونوں کہہ رہے تھے کہ صاحب اور بیگم صاحب نے آپس میں لڑنا بند کر دیا ہے جس پر سب حیران ہیں۔ اور درزی سے کہا گیا ہے کہ فوراً کپڑے سی کر حساب بے باق کرا لے کیونکہ صاحب سمندر پار جا رہا ہے۔

نوزی: خوب۔ تو اس کا مطلب ہے کہ دو یونٹ اور جائیں گی۔ واقعی اس دفعہ کسی بڑے حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ (بیرے سے) سب کے سب چلے گئے تو چھاؤنی خالی سی لگے گی۔

بیرا: جی نہیں۔ باہر سے خچر باتری کی واپسی کا ذکر پنواڑی کی دکان پر ہو رہا تھا۔ ایک نہیں کئی رجمنٹ آئیں گی۔

نوزی: یعنی کہ سمندر پار سے بھی یونٹیں آ رہی ہیں۔ بڑی دلچسپ خبر ہے۔ تمہیں کس نے بتایا؟

بیرا: گھوڑا ڈاکٹر صاحب کا دھوبی سینما میں ملا تھا۔

نوزی:　وہی لمبا سا دھوبی تو نہیں جو ندی کے کنارے وردی کی قمیضوں پتلونوں کو اس جوش و خروش سے گھُما گھُما کر بڑے پتھر پر مارتا ہے جیسے کپڑوں سے پتھّر توڑنے کی کوشش کر رہا ہو؟

بیرا:　جی ہاں وہی۔ یہاں سب دھوبی کپڑے اسی طرح دھوتے ہیں۔ تو وہ کہہ رہا تھا کہ جونہی اطلاع آئی کہ صاحب سمندر پار سے یہاں پہنچنے والا ہے، بیگم صاحب فوراً پہاڑ پر چلی گئی۔ ڈاکیے نے بھی بتایا کہ توپ خانے والوں کی ڈاک آنی تقریباً ختم ہو چکی ہے اور اب خچر باتری والوں کے بیئرنگ لفافے آنے شروع ہو گئے ہیں جنہیں سنبھال کر رکھا جا رہا ہے۔ چھاؤنی کے سب دکانداروں کو اس کا پتہ ہے۔

شارٹی:　(آگے بڑھ کر) افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسی اول جلول باتوں کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے۔

نوزی:　اور مجھے بھی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہ مجھے افواہیں گھڑنے کا شوق ہے نہ انہیں پھیلانے کا۔ فقط باخبر رہنا چاہتا ہوں کہ چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ اگر تم اتنے ہی محتاط ہو تو دکانداروں، بیویوں، نوکروں، ڈاکیوں، ان سب سے کیوں نہیں نمٹتے۔ ہیلو DOC۔ (ڈاکٹر آتا ہے) ڈوک کچھ تھکے تھکے سے لگتے ہو خیریت تو ہے؟

ڈاکٹر:　ان دنوں خیریت کیسی؟ نہ دن کی خبر ہے نہ رات کی۔

نوزی:　شکایت کرتے رہناڈاکٹروں کا محبوب مشغلہ ہے۔ اور پھر کام جتنا بھی کم ہو ظاہر یہی کرتے ہو کہ اسے کرنے کے لئے اتنا ہی کم وقت تمہیں ملتا ہے۔ یعنی کوشش کی جاتی ہے کہ بغیر کسی مصروفیت کے مصروف دکھائی دو۔

ڈاکٹر:　ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ سو سپاہیوں کو طرح طرح کے حفاظتی ٹیکے لگانے پڑیں تو اسے مصروفیت نہیں تو اور کیا کہا جائے گا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

نوزی:　اور یہ سب جو ان مقامی یونٹوں کے ہیں؟

ڈاکٹر:　جی۔ اور یہ کہ ٹیکے لگانے میں اتنا وقت ضائع نہیں ہوتا جتنا کہ ان ہزاروں متعلقہ کاغذات میں جگہ مگر خانہ پوری اور دستخط کرنے میں۔

نوزی:　ان حفاظتی ٹیکوں کا کوئی فائدہ بھی ہے یا ڈاکٹروں نے یونہی پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ جب میں سمندر پار گیا تو کئی روز تک چیچک، ٹائیفائیڈ، ٹیٹنس، زرد بخار، پتہ نہیں کس کس الا بلا کے ٹیکے لگتے رہے جن سے درد بھی ہوا اور حرارت بھی رہی۔ اور جب واپس لوٹا تو یہ سب کچھ بیکار گیا کیونکہ ان میں سے مجھے ایک بیماری بھی تو نہیں ہوئی۔ ویسے یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟

ڈاکٹر:　اللہ بہتر جانتا ہے۔

نوزی: روٹین کے ٹیکوں کے علاوہ بھی کوئی خاص ٹیکہ لگایا؟

ڈاکٹر: ہاں۔ ہیضے کا۔

نوزی: تو پھر یہ مشرقی محاذ ہے۔ اس مرتبہ بڑی زبردست تیاری ہو رہی ہے۔ دو ڈویژن مشرقِ وسطے کے لئے، جن میں ایک آرمرڈ ہے، اور تیسری ڈویژن برما کے واسطے۔ لگتا ہے کہ فرسٹ کلاس آتشبازی ہو گی اس بار۔

(سُرخ مونچھوں والا ایک شخص جو بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا اُٹھ کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔)

سُرخ مونچھوں والا: حضرات میرا تعلق سیکورٹی سیکشن سے ہے۔ آپ چاہیں تو اپنا نام اور پتہ بھی بتا دوں۔ اتنی دیر سے میں آپ کی باتیں سُنتا رہا ہوں۔ ازراہِ کرم اپنی شناختی کارڈ نکالیں۔

(خاموشی طاری ہو جاتی ہے)

فیٹی: (شارٹی کے کان میں) شاباش! کسی آرڈر، انسٹرکشن، رُول یا آرڈیننس کا حوالہ دو۔ اور ذرا جلدی کرو۔

(شارٹی ایک جیب سے عینک نکالتا ہے اور دوسری سے نوٹ بُک اور پنسل)

شارٹی: (نوٹ بُک کے صفحے اُلٹ کر) سپیشل آرڈر نمبر پی ڈبلیو ڈی ۱۵۵ ڈی ایل او کے مطابق اپنے سینیئر افسروں سے پہلی مرتبہ ملنے پر، یا ان سے مخاطب ہوتے وقت سلام کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ایسے وقت جونئیر کے سر پر ٹوپی نہ ہو تو وہ اٹنشن ہو جائے۔ اور کسی مجبوری سے اٹنشن بھی نہ ہو سکے تو کسی اور طریقے سے احترام کا اظہار کرے۔

سُرخ مونچھوں والا: لیکن PUBLIC PLACE میں سلام کرنا لازمی نہیں۔

شارٹی: کون کہتا ہے، اس کی اتھارٹی بتایئے اور ذرا پبلک پلیس کی وضاحت بھی کر دیجئے۔

سُرخ مونچھوں والا: میرے خیال میں آرڈر نمبر ایم سی سی۳۹/۴۹/۹۹ میں یہ لکھا ہے کہ۔

شارٹی: جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس آرڈر کا تعلق گھوڑوں کی نعلبندی سے ہے۔

نوزی: (فیٹی کے کان میں) لگاتے ہو شرط، ہمارا گھوڑا شارٹی جیتے گا۔ دس دس کے یہ پانچ نوٹ اس پر لگاتا ہوں۔

فیٹی: (آہستہ سے) اور میں سُرخ مونچھوں والے پر چھ نوٹ لگانے کو تیار ہوں۔

سُرخ مونچھوں والا: ممکن ہے کہ صحیح حوالہ یاد نہ رہا ہو۔ ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں۔

(ٹیلیفون کی طرف جارہا ہے)

شارٹی: ذرا ٹھہریئے! اُس سپیشل آرڈر میں یہ بھی درج ہے کہ اپنے سے سینیئر سے رخصت ہوتے وقت سلام کرنا ضروری ہے۔ اگر باقاعدہ سلام ممکن نہ ہو، یعنی سر پر کچھ نہ ہو تو اٹنشن ہو کر۔

سُرخ مونچھوں والا: لیکن میں کلب سے باہر تو نہیں جارہا۔

شارٹی: مگر سینیئروں سے تو دُور جارہے ہو۔

سُرخ مونچھوں والا: ایریا، آرڈر ایکس وائی زید /۸۹/ پی ایچ ڈی۔۹۸ میں صاف درج ہے کہ۔۔۔

شارٹی: (ورق اُلٹتے ہوئے) اور یہ دیکھو اے بی سی /۳/ ایل ایل ڈی /۴۲ میں کیا لکھا ہے۔۔۔

سُرخ مونچھوں والا: خواہ کچھ کہتے رہو لیکن مجھے اس واقعے کی رپورٹ اُوپر بھیجنی پڑے گی۔

شارٹی: اگر کہیں میں تمہاری طرح سیکورٹی آفیسر ہوتا تو پہلی افواہ سُنتے ہی متعلقین کو خاموش کرا دیتا۔ یہ نہیں کہ مزے لے لے کر سب کچھ سُنتے رہے حتیٰ کہ ایسی خبروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ تمہارا فرض تھا کہ ان سب کو شروع ہی میں روک دیتے۔ امید ہے کہ اپنی رپورٹ میں اس بات کا بھی ذکر کرو گے۔

نوزی: (فیٹی، ڈاکٹر اور سَنی سے) رقص گاہ میں بڑی اچھی دُھن بج رہی ہے۔ آؤ اُدھر چلیں۔ (دھیمی آواز میں) بہتر یہی ہو گا کہ اب ہونٹ بند رکھے جائیں۔

سَنی: لیکن کان بے شک کھُلے رکھو۔

(چاروں وہاں سے جا رہے ہیں۔ اُدھر شارٹی اور سُرخ مونچھوں والے کی بحث جاری ہے)

سُرخ مونچھوں والا: تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کلب پبلک پلیس نہیں ہے۔ آر اے ایف اے / ۸۰ (بی) / ایم ایس سی (۲) میں جو فہرست ہے اس میں کلب شامل ہے۔

شارٹی: اس کو انسٹرکشن نمبر ۲۹۶ / ۲۹۵ نے ختم کر دیا ہے جو موضوع کی کوئی خاص وضاحت تو نہیں کرتی بس منسوخ کر دیتی ہے۔ لیکن اگر تمہاری ضد مان بھی لی جائے تب بھی کلب میں جو نہی افسر آ جائیں وہ پبلک پلیس ویسے ہی نہیں رہتا۔

سُرخ مونچھوں والا: تمہاری اس انسٹرکشن کو خواہ کتنی ہی ذہانت سے INTERPRET کیا جائے پھر بھی سینما، تھیٹر، ہوٹل، کلب، کیفے، ریل کا ڈبّہ، رقص گاہ وغیرہ پبلک پلیس کے زُمرے میں آئیں گے خواہ وہاں افسر موجود ہوں یا نہیں۔

شارٹی: یہ کہاں لکھا ہے؟

سُرخ مونچھوں والا: اُس تازہ آرڈر میں جو پچھلے ہفتے نکلا ہے۔

شارٹی: لیکن ابھی تک موصول تو نہیں ہوا۔

سُرخ مونچھوں والا: مگر ISSUE تو ہو چکا ہے۔

شارٹی: لیکن وہ۔۔۔

سُرخ مونچھوں والا: مگر یہ

(ان کی آوازیں مدھم ہوتی جاتی ہیں)

ختم شد